قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

اشاعت کا چھہترواں سال

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

مئی 2019ء

علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ

''لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ'' (الحدیث) حضرت محمد ﷺ کے بعد نبوت کا ہر دعویٰ باطل ہے



محنت کشوں کو سلام!

بندۂ مزدور کو جاکر مرا پیغام دے — خضر کا پیغام کیا ہے یہ پیامِ کائنات

اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گر — شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات

مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار — انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

رکوع وسجود وعبادت کا مقصد

جب ذہنِ انسانی اپنے عہد طفولیت میں تھا تو وہ (بچے کی طرح) محسوس اشیاء ہی کو سمجھتا تھا اور اپنے خیالات کا اظہار بھی محسوس طور پر کرتا تھا۔ آج کل کی علمی اصطلاح میں یوں کہئے کہ اس کا علم (Sense Perception) یعنی حواس کے دائرہ میں محدود تھا۔ وہ ہنوز تصورات (Concepts) کے ذریعے حصولِ علم یا اظہارِ خیالات کی منزل تک نہیں پہنچا تھا۔ یعنی وہ (Formalism) کی منزل میں تھا۔ اس نے ''خدا'' کے لئے محسوس پیکر تراش رکھے تھے۔ پوجا پاٹ کے طریق اور دیگر مذہبی رسوم و تقاریب میں بھی سارا زور شکل (Form) پر دیا جاتا اور اسے ہی مقصود بالذات سمجھا جاتا تھا۔

قرآن کریم نے اپنی تعلیم میں انسان کو عہد طفولیت سے نکال کر سن شعور اور بلوغت میں لا کر مخاطب کیا ہے۔ وہ علم بالحواس کے ساتھ تصوراتی علم پر بھی زور دیتا ہے اور دین کے معاملہ میں بھی شکل کی بجائے معنویت (مقصود ومفہوم) کی اہمیت کو نمایاں کرتا ہے لیکن وہ شکل کو بالکل ترک نہیں کرتا۔ عبادات میں رکوع وسجود میں انسان سچ مچ اپنا سر خدا کے سامنے جھکاتا ہے۔ جسم کی ان حرکات و سکنات کے پیچھے ایک فلسفہ کارفرما ہے جسے دورِ حاضر کی اصطلاح میں متوازیت (Parallelism) کہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے نفس (Mind) کے ارادے اور اس کے جسم کی حرکت میں گہرا تعلق ہوتا ہے اور یہ دونوں متوازی چلتے ہیں۔ اس لئے کہ انسان کو تصورات کی تعبیر کے لئے شکل (Form) کے بغیر نہ چارہ ہوتا ہے، نہ تسکین۔ بڑے سے بڑا تصوراتی مفکر بھی جب بات کرتا ہے تو اس کے ہاتھ، پاؤں، سر، آنکھ کی حرکات ناگزیر ہوتی ہیں۔ وہ ان محسوس اشارات کے بغیر اپنے خیالات اور جذبات کا اظہار کر ہی نہیں سکتا۔ (وہ اس طرح مجرد حقائق (Abstract Truths) کو بھی محسوس مثالوں سے سمجھاتا ہے) یہ وجہ ہے کہ قرآن کریم نے (Form) سے اس قدر بلند ہو جانے کے باوجود، بعض مقامات میں اسے باقی رکھا ہے۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ انسان کا اس طرح خدا کے سامنے سر جھکا دینا، اس کے اس جذبہ اور ارادہ کا محسوس مظاہرہ ہوگا کہ وہ قوانین خداوندی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتا ہے۔ یعنی وہ خدا کی کامل اطاعت کا عہد کرتا ہے۔ یہ ''محکومی'' درحقیقت، زندگی کی بلند، مستقل اقدار کو ازخود اپنے اوپر عائد کرنا ہوتا ہے۔ کسی کی خارج سے عائد کردہ پابندیاں نہیں ہوتیں۔ نہ ہی اس میں (Worship) کا وہ مفہوم ہوتا ہے جسے زمانہ قدیم کے انسان نے، فطرت کی قوتوں سے ڈر کر، انہیں خوش کرنے کے لئے، اپنے ذہن سے وضع کیا تھا۔ اگر انسان کا

بقیہ صفحہ نمبر 66 پر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

مئی 2019ء

جلد 72 شمارہ نمبر 5

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات: ہماری تجاویز کی حکومتی ایوانوں میں پذیرائی	ادارہ	4
یک دانائے راز	شیخ اللہ دتا ایڈووکیٹ، لاہور	8
چھ خطبات (گذشتہ سے پیوستہ)	پرویزؒ	30
قرآن پر اعتراضات کے جوابات	خواجہ ازہر عباس، کراچی	40
دو قومی قرآنی نظریہ پر مطالبہ پاکستان (قسط نمبر:25)	ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد	49

ناشر و چیئرمین: محمد اکرم راٹھور

مجلسِ ادارت

ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر منظور الحق

خواجہ ازہر عباس

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

ادارہ کا مضمون نگار کی تحریر سے کُلی اتفاق ضروری نہیں۔

زرِ تعاون: 50 روپے فی پرچہ

پاکستان: 550 روپے سالانہ

رجسٹرڈ ڈاک: 800 روپے سالانہ

بیرونِ ملک: 2500 روپے سالانہ

رجسٹرڈ ڈاک: 5000 روپے سالانہ

ENGLISH SECTION

Surah *Muhammad* (محمّد) – Durus-al-Qur'an: Chapter 1

By G. A. Parwez

(Translated by: Mansoor Alam) 61

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان)

Phone: 042-35714546

Cell: 0321-4460787

idarati@gmail.com www.facebook.com/Talueislam

Bank Account Idara Tolu-e-Islam

National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulberg Lahore

For Domestic Transactions

Bank A/C No: 0465004073177672

For International Transactions

IBAN:PK36NBPA0465004073177672

Swift Code: NBPAPKKAA02L

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

یہی مقصودِ فطرت ہے، یہی رمز مسلمانی
اخوت کی جہاں گیری، محبت کی فراوانی
بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی، نہ ایرانی نہ افغانی
میانِ شاخساراں صحبت مرغِ چمن کب تک!
ترے بازو میں ہے پروازِ شاہین قہستانی
گمان آبادِ ہستی میں یقیں مردِ مسلماں کا
بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی
مٹایا قیصر وکسریٰ کے استبداد کو جس نے
وہ کیا تھا، زورِ حیدرؓ، فقر بوذرؓ، صدقِ سلمانیؓ
ہوئے احرارِ ملت جادہ پیما کس تجمل سے
تماشائی شگافِ در سے ہیں صدیوں کے زندانی
ثباتِ زندگی ایمانِ محکم سے ہے دنیا میں
کہ المانی سے بھی پائندہ تر نکلا ہے تورانی
جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کرلیتا ہے یہ بال و پرِ رُوح الامیں پیدا

(بانگِ درا۔علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

ادارہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لمعات

ہماری تجاویز کی حکومتی ایوانوں میں پذیرائی

اکتوبر 2018ء کے ماہنامہ طلوعِ اسلام کے لمعات میں ''ریاستِ مدینہ کی دو خصوصیات'' کا تفصیل سے ذکر کیا گیا تھا۔ پہلی خصوصیت کے ضمن میں لکھا گیا کہ ''ریاستِ مدینہ'' کا یہ فریضہ ہے کہ وہ افرادِ معاشرہ کی ضروریات زندگی (وہ اسباب و ذرائع جو انسانی صلاحیتوں کی نشوونما کے لئے ضروری ہیں جیسے روٹی، کپڑا، مکان، تعلیم، صحت) کو پورا کرنے کو یقینی بنائے۔ اس بنا پر آئین کی رو سے جن بنیادی حقوق کی ضمانت دی گئی ہے ان میں ''رزق کے حق'' کی شق کا اضافہ کیا جائے نیز ''طلوعِ اسلام'' نے یہ تجویز دی کہ آئینِ پاکستان 1973ء کے آرٹیکل 38 ڈی میں ضروری ترمیم کی جائے اور اس میں قرآنی معنوں میں ''یتیم و مسکین'' کی کفالت کی محض اخلاقی حیثیت کی بجائے عملی اور حقیقی یقین دہانی کے لئے لوکل گورنمنٹ قوانین میں ترامیم کے ذریعے عوامی لوکل نمائندوں کو ذمہ دار ٹھہرایا جائے۔

ہمیں خوشی ہے کہ موجودہ حکومت نے ہماری تجاویز کو قبول کرتے ہوئے ان کو عملی جامہ پہنانے کا اعلان کیا ہے۔

27 مارچ 2019ء کو وزیراعظم پاکستان جناب عمران خان نے پروگرام ''احساس اور کفالت'' کے اجراء کی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ:

> ''ریاست عوام کو پانچ بنیادی چیزیں روٹی، کپڑا، مکان، صحت اور تعلیم فراہم کرے گی، یہ ضروریات عوام کا بنیادی حق ہیں، اس حوالے سے ہم نے آئین کے آرٹیکل 38 ڈی میں ترمیم کرنی ہے۔ یہ دباؤ ہم اپنے اوپر ڈال رہے ہیں، کوئی بھی شہری ان کے حصول کے لئے عدالت میں جا سکے گا۔ انہوں نے غربت کے خاتمے کو جہاد قرار دیتے ہوئے اس پروگرام پر عمل درآمد کے لئے نئی وزارت بنانے کا اعلان کر دیا جو رابطے کا کام کرے گی۔ غربت کے خاتمے کے لئے امداد دی جائے گی۔''
>
> (روزنامہ دُنیا 27 مارچ 2019ء)

اب ہم ذیل میں قارئینِ طلوعِ اسلام کی دلچسپی کے لئے طلوعِ اسلام اکتوبر 2018ء کے لمعات کا متعلقہ حصہ درج

کرتے ہیں۔

نوعِ انسان کو سامانِ زیست (رزق) بہم پہنچانے کی ذمہ داری خدا تعالیٰ نے خود اپنے اوپر لے رکھی ہے۔

نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ۚ ۔۔۔(6:151) نیز (17:31)

ترجمہ: ہم تمہارے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کے رزق کے بھی۔

یہی نہیں بلکہ ہر ذی حیات کے رزق کا ذمہ بھی اللہ پر ہے:

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (11:6)

ترجمہ: اور زمین میں کوئی جاندار نہیں مگر اللہ ہی کے ذمہ اس کا رزق ہے۔

جو مملکت خدا کے نام پر قائم ہو، اس کا فریضہ ہوتا ہے کہ انسانوں (اور دیگر مخلوق) کے سلسلہ میں جو ذمہ داریاں خدا تعالیٰ نے اپنے اوپر لے رکھی ہیں، وہ انہیں پورا کرے۔ لہٰذا اسلامی فلاحی ریاست کا فریضہ ہے کہ وہ افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانے کو یقینی بنائے۔

اس بنا پر ضروری ہے کہ آئین کی رُو سے جن بنیادی حقوق کی ضمانت دی گئی ہے، ان میں اس شق کا اضافہ کیا جائے۔

رزق (سامانِ زیست) کا حق:

افرادِ معاشرہ کو بنیادی ضروریاتِ زندگی (بشمول وہ اسباب و ذرائع جو انسانی صلاحیتوں کی نشوونما کے لئے ضروری ہیں جیسے تعلیم و تربیت) بہم پہنچائی جائیں گی۔ لیکن یہ حق مشروط ہے اُس شرط کے ساتھ کہ کام کرنے کے قابل ہر فرد، اپنی صلاحیت اور استعداد کے مطابق وہ کام سرانجام دے جسے اس کے سپرد کیا گیا ہے۔

(ب) قرآنِ کریم کی سورہ الماعون (نمبر 107) میں یوں ارشاد ہے:

اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ۝١ فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ ۝٢ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝٣ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۝٤ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۝٥ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ۝٦ وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ۝٧

کیا تم نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا جو زبان سے تو اسلام کا اقرار کرتا ہے لیکن عملاً دین کی تکذیب کرتا ہے۔ یعنی اس کا طرزِ عمل اس امر کی دلیل ہے کہ اگر دین داری یہی ہے جس کا مظاہرہ اس کے اعمال سے ہوتا ہے، تو پھر دین کا ہر دعویٰ جھوٹا ہے (53:33، 95:7، 33-75:32)۔

(دین کا مقصد یہ تھا کہ معاشرہ میں جو شخص بے یار و مددگار رہ جائے اسے محسوس نہ ہونے پائے کہ وہ تنہا اور بے کس ہے۔ اور اگر کسی وجہ سے، کسی کی کوئی ضرورت رُک جائے تو اُسے فوراً پورا کر دیا جائے۔ لیکن) اس دیندار کی حالت یہ ہے کہ جو شخص بے یار و مددگار رہ جائے، یہ اُسے دھکے دیتا ہے، اور محتاجوں کی مدد نہ خود

کرتا ہے، نہ دوسروں کو ایسا کرنے کی ترغیب دیتا ہے (69:34، 89:18)۔

کام تو ایسے کرتا ہے، لیکن اپنے آپ کو ''دیندار'' ظاہر کرنے کے لئے نمازیں بہت پڑھتا ہے۔ اسی قسم کے نمازی ہیں جن کی نمازیں ان کی تباہی کا باعث بن جاتی ہیں؛ اس لئے کہ یہ نمازیں پڑھ کر اپنے آپ کو فریب دے لیتے ہیں (یا دوسروں کو فریب دیتے ہیں) کہ یہ بڑے متقی، پرہیزگار ہیں۔

انہیں اس کا پتا ہی نہیں کہ صلوٰۃ کا مقصد کیا ہے؟ اس کا مقصد تھا ایک ایسے معاشرہ کا قیام جس میں تمام افراد، قوانینِ خداوندی کا اتباع کریں اور عالمگیر انسانیت کو سامانِ نشوونما بہم پہنچتا رہے۔ یہ اس کی اس غرض وغایت سے تو غافل رہتے ہیں اور اس کے محسوس ارکان (قیام، رکوع، سجود وغیرہ) کی ادائیگی کے بعد سمجھ لیتے ہیں کہ ہم فریضہ خداوندی سے سبکدوش ہو گئے (9:54)۔

ان کی اس خود فریبی کا نتیجہ ہے کہ یہ ایک طرف نمازیں بھی پڑھتے ہیں اور دوسری طرف رزق کے اُن سرچشموں پر، جنہیں بہتے پانی کی طرح ہر ایک کی ضروریات کے لئے کھلا رہنا چاہئے، بندلگا کر، ان پر اپنا قبضہ جما لیتے ہیں، اور اس طرح ضرورت مندوں کو سامانِ زیست سے محروم کر دیتے ہیں (یوں یہ تکذیبِ دین کرتے اور ننگِ اسلام بنتے ہیں)۔

نبی کریم ﷺ کے انداز کی فلاحی ریاست بنانے کے لئے بہت محنت کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے آئین اسلامی جمہوریہ پاکستان 1973ء کے آرٹیکل 38 (د) میں ضروری ترمیمات کرنا ہونگی تاکہ اس میں قرآنی معنوں میں ''یتیم اور مسکین'' کا اضافہ کیا جائے اور اس کی محض اخلاقی حیثیت کی بجائے، عملی اور حقیقی یقین دہانی کے لئے لوکل گورنمنٹ قوانین میں ترامیم کے ذریعے، عوامی لوکل نمائندوں کو ذمہ دار ٹھہرایا جائے۔ مزید یہ کہ مفت خوروں اور منگتوں کی جماعتوں اور ان کے سرپرست ٹھیکیداروں سے عوام کی جان چھڑائی جائے۔ اس بارے میں مناسب قانون سازی درکار ہوگی اور نگرانی واحتساب کا ایک نظام قائم کرنا ہوگا۔

(لمعات، ماہنامہ طلوعِ اسلام، اکتوبر 2018)

ملتان کے احباب کے لیے ضروری اطلاع



اب طلوع اسلام کی تمام بکس اور ''طلوع اسلام'' میگزین مندرجہ ذیل پتہ پر مل سکتا ہے



ملک محمد صفدر ایڈووکیٹ نمبر 54 محمڈن بلاک ضلع کچہری۔ ملتان فون نمبر: 0334-6093266

مرثیہ کیوں؟

آپ گھر میں ہوں یا دفتر میں، بازار میں ہوں یا دکان پر، ریل پر ہوں یا بس میں، تانگے میں ہوں یا میٹرو پر، بارات میں ہوں یا جنازے کے ساتھ — جہاں کہیں دو مسلمان جمع ہوں وہ مسلمانوں کی عام حالت کے مرثیہ خواں نظر آئیں گے۔

پہلے تو صرف اتنا ہی کہا جاتا تھا کہ قوم میں سخت اَفلاس ہے۔ لوگوں کے پاس کھانے کو روٹی، پہننے کو کپڑا اور رہنے کو مکان نہیں۔ بیمار پڑ جائیں تو دوائی نہیں اور مر جائیں تو کفن دفن تک کے لئے پیسے نہیں۔ اب اس کے ساتھ اس کا بھی اضافہ ہوتا ہے کہ لوگ بد دیانت ہیں، بے ایمان ہیں، چور ہیں، جھوٹے ہیں۔ بلیک مارکیٹ، رشوت، نفع خوری، اعزّہ پروری اور اَقربا نوازی عام ہے۔ افراد سے آگے قوموں تک جایئے تو مسلمانوں کا تقریباً ہر ملک تباہ حال ہے۔ عوام میں جہالت اور غربت ہے، خواص خائن اور غدّار ہیں۔

یہ مرثیہ تو عام ہے لیکن کوئی یہ نہیں بتاتا کہ اس کی آخر وجہ کیا ہے؟

مسلمان کیوں ہر جگہ پستی اور ذلت میں ہیں؟

اگر آپ کو اس سوال سے دلچسپی ہے تو آپ یہ کتاب ضرور دیکھئے جس کا نام ہے:

اَسبابِ زوالِ اُمّت

کمپیوٹر کمپوزنگ اور کتابت کا حسین اِمتزاج | طباعت کا اعلیٰ ترین معیار

طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) 25 بی، گلبرگ 2، لاہور
tolueislam@gmail.com ; www.islamicdawn.com
www.facebook.com/tolueislam.trust
Phone: +92 42 35753666

شیخ اللہ دتا ایڈووکیٹ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یک دانائے راز

عمر ہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تاز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

علامہ غلام احمد پرویزؒ المعروف ''باباجی'' 9 جولائی 1903ء کو پیدا ہوئے اور 24 فروری 1985ء کو اس دارِفانی سے رخصت ہو گئے۔ اس دوران ان کی اپنی زندگی میں کئی نشیب و فراز آئے لیکن جس بات نے انہیں مشترکہ ہندوستان، اس وقت کے عالمِ اسلام اور بعد میں پاکستان میں سب سے زیادہ متعارف کرایا، وہ قرآن کریم کی روشنی میں، روزمرہ کی زندگی اور قومی مسائل کا حل پیش کرنا ہے۔

اس سلسلہ میں جن افراد نے ان کی سوچ پر گہرا اثر چھوڑا، ان میں تین چار شخصیات بے حد اہم ہیں۔ ایک ان کے دادا جان مرحوم جنہوں نے ان کی ابتدائی تربیت کی۔ دوسرے علامہ محمد اقبالؒ جنہوں نے انہیں مذہب اور دین کا فرق سمجھانے کے ساتھ، قرآن فہمی پر نہ صرف آمادہ کیا بلکہ صحیح انداز میں اس راہ کی دشواریوں کے حل میں معاون ہوئے۔ علامہ اقبالؒ ہی نے انہیں عربی ادب میں مہارت کے لیے علامہ محمد اسلم جیراجپوری مرحوم کی صحبت میں بھیجا جن کے ساتھ ان کا قریبی تعلق 8، 10 سال سے زیادہ رہا۔ علامہ محمد اقبالؒ ہی کا یہ حسنِ عمل تھا کہ انہوں نے پرویز صاحب کو قائداعظم محمد علی جناحؒ سے وابستہ کر دیا۔ یہی وہ چار شخصیات ہیں جن سے وابستگی کی ایک نمایاں جھلک باباجی کی پوری زندگی میں نظر آتی ہے۔ ان کے علاوہ ان کے رفقاء ابتدائی دائرہ طلوعِ اسلام دہلی، ادارہ طلوعِ اسلام کراچی اور لاہور، بزم ہائے طلوعِ اسلام (اندرون و بیرون پاکستان) کے ساتھی ستاروں کے ایک جھرمٹ کی طرح ان کے گرد رہے۔ ان سے اکتسابِ فیض بھی کیا اور نشر و اشاعتِ فکرِ قرآنی میں ان کی معاونت بھی کی۔ اللہ ان سب کو اپنی رحمتوں اور برکتوں سے نوازے۔

یہ 1982ء کی بات ہے کہ اس وقت کے فیڈرل وزیر اطلاعات جناب لیفٹننٹ جنرل مجیب الرحمٰن خاں صاحب نے پاکستان ٹی وی کے کارکنان کو ہدایت کی کہ پاکستان کے ذہین افراد (Minds) کو ریکارڈ کیا جائے۔ چنانچہ اس تاکیدی حکم کے تابع انہوں نے بشمولِ دیگر، علامہ پرویزؒ صاحب کو ریکارڈ پر لینے کا فیصلہ کیا اور اس سلسلہ میں پی ٹی وی کے جناب محمد عظیم صاحب نے اپنے ریکارڈنگ کیمرہ کے ساتھ، باباجی کے کمرہ میں، یہ ریکارڈ تیار کرنا شروع کیا۔ یہ ریکارڈ باباجی کے اپنے

الفاظ میں تھا۔ طریقِ کار یہ اختیار کیا گیا کہ سوال و جواب کی ایک مختصر محفل منعقد کی جائے جس میں اس وقت کی اہم شخصیات شریک ہوتی تھیں (جن کی اکثریت اب مرحوم ہو چکی ہے) وہ بابا جی سے ان کی شخصیت، عملی زندگی اور علمی سرگرمیوں کے بارے میں سوال کرتے تھے۔ البتہ محترم شیخ عبدالحمید صاحب (انچارج شعبۂ مطبوعات وحسابات ادارہ طلوعِ اسلام) اپنے کیمرے اور آڈیو کیسٹ پر ساتھ کے ساتھ ریکارڈ کرتے جاتے تھے (یہ بھی مرحوم ہو چکے ہیں)۔

ہم موجودہ چیئرمین ادارہ طلوعِ اسلام جناب محمد اکرم راٹھور صاحب کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے اس ریکارڈ سے یہ گفتگو تحریر کی صورت میں منتقل کرنے کا کام شروع کر دیا ہے۔ میں آج کی محفل میں اس تحریر اور کمپوزنگ کا کچھ حصہ آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں کہ ان کے یومِ وفات پر انہیں یاد رکھنے کا یہ ایک اچھا طریقہ ہوگا۔

میاں عبدالخالق صاحب ایکسیئن۔ معمارِ مینارِ پاکستان، لاہور

سوال: آپ نے علامہ اقبالؒ سے اپنے غائبانہ تعارف کا ذکر فرمایا ہے۔ کیا اُن سے آپ کی ملاقات بھی ہوئی تھی اور آپ میں جو بنیادی تبدیلی رُونما ہوئی، کیا اُس میں اُن کا بھی کچھ حصہ ہے؟

جواب: جی میاں صاحب! ملاقات ہی نہیں ہوئی، ملاقاتیں ہوئیں۔ اور یہ قصہ بھی بڑا دلچسپ ہے۔ یہاں پھر میں یہ کہوں گا کہ کوئی منطقی توجیہ کام نہیں دے رہی۔ ان کی جو نگاہ کی وسعت اور فراست تھی۔ وہ کام دیتی ہے اس مقام پر۔ 22-1921ء کا واقعہ ہے کوئی ساٹھ سال پہلے کی بات ہے اس لیے، وہ یہ جوسن ہیں اور سال ہیں، ان کے متعلق میں متعین طور پہ نہیں کہتا، وہ دھندلا جاتے ہیں نقوش۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ جب میں پہلی دفعہ لاہور آیا ملازمت کے سلسلے میں تو دادا جان نے آتے وقت مجھ سے کہا کہ دیکھو بیٹا تم لاہور جا رہے ہو، دو شخصیتیں ہیں وہاں اُن سے ملنا۔ ایک تو نواں کوٹ میں امام الدین ہیں۔ ان کے متعلق کہا جاتا تھا کہ لاہور کے قطب ہیں۔ ایک اُن سے ملنا اور ایک ڈاکٹر اقبالؒ سے ملنا اُن کی مثنوی میں نے تمہیں پڑھائی تھی۔ اور اُس زمانے میں، اُس کے بعد ڈاکٹر اقبالؒ کے خلاف کتنا مخالفت کا طوفان برپا ہوا تھا سارے ملک کے اندر۔ تو جتنے بھی یہ وہ تصوف کے ساتھ دلچسپی رکھنے والے لوگ تھے، وہ سارے ان کے خلاف ہو چکے ہوئے تھے۔ ان ہنگاموں کے بعد انہوں نے مجھ سے کہا کہ ان سے ملتے رہنا، وہ بڑی عظیم شخصیت ہیں۔ تو میں آیا تو میں وہ جو قطب تھے لاہور کے، میں کسی کے خلاف کوئی ایسی بات نہیں کرتا، اُن سے تو میں ایک آدھ مرتبہ ملا کیونکہ اقبالؒ کی عظمت اور جو قرآن کے متعلق انہوں نے کہا تھا، وہ میرے دل پر بڑی چھائی ہوئی تھی۔ تو علامہ اقبالؒ سے ملاقات ہوئی، ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ ان میں ایک خصوصیت بڑی اہم تھی وہ کسی ملنے والے کو بھی یہ احساس نہیں دلاتے تھے کہ وہ کتنی عظیم شخصیت اور کتنے بڑے مفکر اور کتنے بڑے عالم ہیں۔ وہ ملنے والے کی سطح پہ آ جایا کرتے تھے۔ آپ کو شاید معلوم ہوگا کہ وہ عام گفتگو پنجابی میں کیا کرتے تھے۔ تو پنجابی میں گفتگو سے ایک تو بے تکلّفانہ بات آ جاتی ہے۔ اب 22-1921 کے اندر میری عمر ہی کیا تھی اور محض ایک طالب علم کی حیثیت سے وہاں جا رہا ہوں۔ لیکن انہوں نے بہت جلدی یہ جو تفاوت تھا درمیان کا مٹا دیا' اس سے اکتسابِ فیض کے

دروازے کھل جاتے تھے‘ جرأتیں بیباک ہوجاتی تھیں ان سے گفتگو کرنے کی۔ ایسا ہوتا تھا جیسے ہم برابر کی حیثیت سے گفتگو کر رہے ہیں صاحب۔ وہ تو میں عرض کروں کہ فکرِ اقبالؒ سے جو کچھ میں نے حاصل کیا مختصراً وہ یہ تھا کہ اسلام میں سند اور حجت صرف خدا کی کتاب ہے۔ بڑی چیز تھی۔ عقائد ہوں یا مسالک‘ روایات ہوں یا تاریخ‘ فقہ ہو یا تفسیر۔ جو قرآن کے مطابق ہے، صحیح ہے اور جائز ہے، جو اس کے خلاف ہے۔ وہ صحیح نہیں غلط ہے اور اگر شریعت کی بات ہے تو ناجائز ہے۔ یہ چیز بڑی پختگی سے اُس زمانے میں آ گئی کہ سند صرف خدا کی کتاب ہے۔ اور آپ نے دیکھا ہوگا کہ اُس کے بعد آج تک میرے ہاں یہ چیز مسلسل آ رہی ہے۔ یعنی یہ نکتہء ماسکہ ہے میری فکر کا۔ جو کچھ میں نے کیا ہے اُس کے بعد اس کا بنیادی اساسی نکتہ یہ ہے کہ سند جو ہے وہ خدا کی کتاب ہے۔ یہ پہلی چیز تھی جو فیضانِ اقبالؒ سے یا فکرِ اقبالؒ سے مجھے وہاں حاصل ہوئی تھی۔ دوسری چیز یہ بات کہ قرآن اپنی تفسیر آپ کرتا ہے۔ اُن کے الفاظ میں کہ سورج کو چراغ لے کر ڈھونڈا نہیں جاتا، وہ اپنی دلیل آپ ہوتا ہے۔ دوسری چیز یہ تھی کہ قرآن کو سمجھنے کے لیے کسی خارجی سہارے کی ضرورت نہیں ہے۔ قرآن، قرآن سے سمجھا جاسکتا ہے۔ تو اب اس چیز نے بھی میرے اندر ایک انقلاب پیدا کیا تو میں تو چونکہ اور انداز سے ہی قرآن کو سمجھنے کا عادی چلا آ رہا تھا تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ تو از سرِ نو پھر سمجھنا پڑے گا، اس کو ایک معیار قرار دینا پڑے گا اس کے بعد‘ سند قرار دینا پڑے گا اس کے بعد۔ تو پوچھا یہ کہ اس کے سمجھنے کا طریقہ کیا ہے؟ وہ ان کے ایک فقرے کے دو ٹکڑے ہیں متعدد مقامات پہ انہوں نے اس کو دہرایا بھی ہے کہ قرآن سمجھنا ہو تو محاورۂ عرب اور تصریفِ آیات کی رُو سے سمجھا جاسکتا ہے۔ یہ اصطلاحی چیز ہے اور بڑی اہم چیز ہے یہ۔ اس کے معنی یہ ہیں محاورۂ عرب کے‘ انہوں نے کہا کہ زمانۂ نزولِ قرآن میں قرآنِ کریم کے الفاظ کے جو معنی اور مفہوم وہاں کے اُس زمانے کے عرب لیتے تھے، وہی اس کے صحیح معنی ہیں۔ اس لیے کہ علم اللسان کے علماء اس حقیقت کو جانتے ہیں کہ مرورِ زمانہ سے زبان پر بڑا اثر پڑتا ہے اور اُس کے الفاظ کے معنی کہیں سے کہیں چلے جاتے ہیں اور بڑی تبدیلی اُس میں واقع ہوتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ عربی زبان تو وہی ہے آج بھی۔ لیکن ان مفرداتِ قرآنی (قرآن کے ان الفاظ کو مفردات کہتے ہیں) کے وہ مفاہیم جو اُس دَور میں اُن عربوں کے سامنے تھے اور جنہیں کچھ پوچھنے کی ضرورت پیش نہیں آئی، جنہوں نے کوئی تفسیر نہیں لکھی، جنہوں نے کوئی لغت نہیں لکھا، وہ جب لفظ سامنے آتا تھا تو سمجھ جاتے تھے کہ کیا کہا۔ وہ جب تک مفہوم سامنے نہیں ہوگا، قرآن سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ تو یہ تو ہے محاورۂ عرب۔ اور دوسری چیز بلکہ اسی محاورۂ عرب میں انہوں نے کہا اور ان کی تعلیم میں بھی یہ چیز موجود ہے کیونکہ وہ ان کا بنیادی نکتہ ہے کہ عربی زبان پر یا قرآن کے مفردات پر کوئی بہت دُور جا کر اس کا اثر نہیں پڑا۔ عباسیوں کے زمانے میں انہوں نے کہا کہ یہ ملوکیت میں مملکت تو عربوں کی تھی۔ لیکن اُس میں ذہنیت اور ثقافت ساری ایرانیوں کی آ چکی ہوئی تھی۔ یہ عجیب چیز ہے جیسا کہ آپ کو شاید معلوم ہو کہ شیعہ حضرات کے تو ایک طرف رہا۔ سنیوں کے احادیث کے جو چھے مجموعے ہیں، جنہیں صحاح ستہ کہا جاتا ہے۔ صحیح ترین مجموعے احادیث کے چھے‘ چھے کے چھے مجموعوں کے جو جامعین ہیں وہ سارے ایرانی ہیں، ایک بھی عرب نہیں ہے۔ یعنی نبی اکرم ﷺ اور حضور ﷺ

کے زمانے کے صدرِ اول کے کوائف اور واقعات اور روایات' ان کو جمع کرنے والا' ان پہ تنقید کرنے والے' ان کی چھانٹی کرنے والا' کوئی عرب نہیں ہے، ایرانی ہیں۔ سب سے پہلے تاریخ آپ کے ہاں جو لکھی گئی، وہ لکھنے والا ایرانی ہے۔ سب سے پہلی تفسیر جو آپ کے ہاں قرآن کی لکھی گئی، وہ لکھنے والا ایرانی ہے۔ آپ کو یاد ہے اقبالؒ کے ہاں تو ایک اصطلاح ہے عجمی اسلام۔ وسیع تر معنوں میں تو وہ ہر غیر عربی کو عجمی کہتے ہیں لیکن یہ جو پہلی چیز ہے ناں کہ عباسیوں کے زمانے میں یہ عجم کے ذہنی اثرات اتنے غالب آ گئے تھے کہ ہمارے ہاں کی نہ روایات، نہ تفسیر، نہ فقہ، نہ علم الکلام، نہ تصوف' کچھ بھی نہیں بچا جس کے اوپر اس کی چھاپ نہ ہو۔ یہ اُن کے الفاظ ہیں۔ انہوں نے کہا یہ تو وہاں سے بات شروع ہوئی۔ اور جتنا اسلام اس کے بعد آپ کے ہاں چلا آیا ہے وہ سارا اُس دَور کا مرتب کردہ ہے، اُس سے پہلے کی تو کتاب ہی کوئی نہیں ہے، آپ کے ہاں۔ یہ عجیب چیز ہے کہ بنواُمیہ کے زمانے میں کوئی کتاب اس میں نہیں ہے، صرف قرآن تھا۔ تو انہوں نے کہا کہ یہ ہے وہ قرآن جو آپ کے ہاں چلا آ رہا ہے۔ تو اس سے پھر آپ سوچ لیجیے کہ اس کی رُو سے آپ کیا اسلام سمجھ سکیں گے، کیا قرآن سمجھ سکیں گے۔ وہیں چلیے واپس' زمانۂ نزولِ قرآن کے زمانے میں کہ ان مفردات کا عرب جو مفہوم لیتے تھے، اُس مفہوم کو متعین کیجیے۔(1) دوسری چیز تھی تصریفِ آیات۔

قرآنِ کریم کا انداز ہماری تصنیفات جیسا نہیں ہے۔ ہماری کتاب دیکھیے تو اُس میں باب ہوتے ہیں، ہر باب کا ایک موضوع ہوتا ہے اور جو کچھ اُس موضوع کے متعلق کہنا ہوتا ہے، اُس باب کے اندر کہہ دیا جاتا ہے۔ پھر اگلا باب آتا ہے پھر اُس کے بعد اگلا باب آتا ہے۔ فہرست سے معلوم ہو جاتا ہے کہ کس باب میں کیا کچھ لکھا گیا ہے۔ قرآن کا انداز یہ نہیں ہے۔ قرآن میں ایک چیز ایک مقام پہ آتی ہے۔ اُس کا اضافہ کہیں اور آگے چل کے آتا ہے، استثناء کہیں اور جا کر آتی ہے۔ تشریح اُس کی کہیں اور جا کے، کہیں واقعات کے رنگ میں، کہیں تاریخی شواہد کے رنگ میں، کہیں قوانینِ فطرت کی رُو سے۔ مختلف مقامات پر اس طرح سے وہ چیز پھیلی ہوئی ہوتی ہے۔ اگر ایک موضوع کے متعلق آپ نے سمجھنا ہو کہ قرآن کیا کہتا ہے تو یہ سارے مقامات آپ کے سامنے بیک وقت ہونے چاہئیں۔ احکام کے سلسلے تک تو یہ آسان بات ہے کہ کہاں کہاں یہ آیا ہے، وہ تو الفاظ سے بھی یہ چیز ہو سکتی ہے اکٹھی۔ لیکن جب حقائق اور معارف کی طرف آئیں گے جب اصول و اقدار کی طرف آپ آئیں گے تو وہ مختلف انداز میں پھیلی ہوئی چیز آپ کو ملے گی۔ ہو سکتا ہے کہ لفظی اعتبار سے وہ بات ویسے ہو ہی نہ۔ لیکن معنی کے اعتبار سے اُس کے اندر سے وہی چیز نکل آئے جس کی تلاش آپ کو ہے۔ تو اس طرح قرآن کو Codify کرنے کی ضرورت ہے جسے کہا جائے گا قرآن کو Classify کرنے کی ضرورت ہے۔ تو یہ ہے جسے تصریفِ آیات کہا جائے گا۔(2) دو چیزیں ہو گئیں: محاورۂ عرب' تصریفِ آیات۔

پھر اگلی چیز یہ کہ قرآن تو علم کے متعلق گفتگو کرتا ہے تو علمِ انسانی تمہارے عصرِ حاضر تک تمہارے زمانے تک جس سطح

---

(1) اس کے لئے محترم پرویزؒ صاحب نے لغات القرآن ترتیب دی ہے۔ (2) بابا جیؒ نے اس بارے میں تبویب القرآن مرتب کی ہے۔

تک آ چکا ہو، وہ تمہارے ذہن کے اندر، تمہاری آنکھوں کے سامنے ہونا چاہیے کیونکہ قرآن نے مختلف موضوعات پہ بحث کی ہے۔ اوران تمام علوم کے متعلق علمِ انسانی نے جہاں تک ترقی کی ہے وہ سامنے رکھو گے تو قرآن کا وہ جو نکتہ اُس نے کہا ہے، تب سمجھ میں آئے گا۔ تو اگلی چیز یہ آ گئی (1)۔ اور اُس سے آگے یہ کہ قرآن نے غور وتدبر کا حکم ہر شخص کو دیا ہے جو قرآن سمجھنا چاہتا ہے۔ غور وتدبر نہ تو کسی خاص زمانے تک محدود ہے نہ کسی شخصیت یا گروہ تک محدود؛ قیامت تک قرآن نے زندہ و پائندہ رہنا ہے، قیامت تک انسان کے علم نے ترقی کرنی ہے۔ ہر دَور کے انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ خود غور وفکر کرے اپنے دور کے علوم کی روشنی میں۔ ان دو شرطوں کے ماتحت: محاورۂ عرب اور تصریفِ آیات۔ تو انہوں نے یہ کہا کہ اس انداز سے اگر یہ سمجھا جائے تو پھر کہہ سکتے ہو کہ میں نے قرآن سمجھا ہے۔ جو کچھ سمجھا ہے تم نے وہ قرآن نہیں سمجھا، کہہ سکتے ہو کہ فلاں نے قرآن جو سمجھا تھا وہ چیز میں نے پڑھ لی ہے، تم نے قرآن نہیں سمجھا ہے۔ تو قرآن کو یوں سمجھنا چاہیے۔ یہ تھی میاں صاحب! فکرِ اقبالؒ سے مجھے جو رہنمائی ملی اور اس میں آپ دیکھیے کہ مجھے یہ سب کچھ نئے سرے سے پڑھنا پڑا۔ وہ اتنا ہی نہیں ہوا کہ فکری طور پہ کچھ تبدیلی ہوئی بلکہ بات یہ تھی کہ اگر مجھے واقعی قرآن سمجھنا ہے تو یہ تو پھر ایک بالکل نئی پٹڑی تھی جس پہ مجھے چلنا پڑا۔ یہ چیز تھی اُس دور میں آئی۔ آپ سوچیے کہ ابھی میری عمر کیا تھی اور اُس کے ساتھ یہ کتنی بڑی چیز ذمہ دارانہ تھی، کتنی بڑی یہ وہ سنگ تراشی تھی، خارہ شگافی تھی جس میں سے جوئے شیر کالانا تھا۔ بہرحال یہ چیز لے کے اقبالؒ کے میکدہ سے میں باہر آیا۔

اور نکلا جو پھر میکدے سے تو دنیا بدل گئی

ڈاکٹر صلاح الدین اکبر صاحب۔

سوال: آپ نے یہ سب کچھ یہ تنہا کیا ہے یا کوئی ادارہ یا جماعت بھی آپ کے ساتھ تھی؟

پرویز صاحبؒ: کوئی ادارہ کوئی جماعت کوئی ریسرچ سکالر کوئی میرے ساتھ رفیق تھے ہی نہیں؛ یہ سب کچھ میں نے تنہا کیا ہے اور تیس سالہ ملازمت بھی ساتھ کی ہے۔ اب یہ بات کہ میں نے کیسے کر لیا ہے اس کیسے کا، جواب جو ہے اُس بارے میں، میں ہی ورطۂ حیرت میں گم نہیں ہو جاتا، جو بھی کوئی سنتا ہے، اُس کی بھی کیفیت یہ ہوتی ہے۔ اور بڑا ایک دلچسپ واقعہ ہے اُس سے بھی بات صاف ہو جائے گی۔ ایک دفعہ ایک عراقی عالم آئے اور ان کے ساتھ یہاں انفرمیشن ڈیپارٹمنٹ کے کوئی آفیسر بھی تھے جو ان کو ساتھ لائے تھے۔ اور انہوں نے آ کے یہ مجھ سے کہا کہ وہاں ہم نے جماعت تیار کی ہے جو قرآنِ کریم کا لغت مرتب کرنا چاہتی ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ جہاں جہاں بھی قرآن کے لغت مرتب ہوئے ہیں، میں جا کے Personally ان لوگوں سے ملوں۔ ان سے پوچھوں کہ جماعت کتنی تھی، افراد کتنے تھے، سکالر کتنے تھے، کتنا وقت لگا، کتنا پیسہ خرچ ہوا یہ سارا کچھ۔ تو اس سلسلے میں تمہارا لغات جو ہے اُس کی بڑی اہمیت ہے تو میں یہ انفرمیشن لینے کے لیے آیا ہوں۔ تو میں نے ان سے جب یہ کہا کہ صاحب! اس میں نہ کوئی جماعت تھی، نہ کوئی ریسرچ سکالر تھے، اور نہ کوئی ادارہ تھا، نہ کوئی تنظیم

(1) باباجیؒ نے ''انسان نے کیا سوچا؟'' میں یہ مشکل حل کر دی ہے۔

تھی، نہ کہیں سے کوئی مدد تھی، یہ سارا کچھ میں نے تنہا ہی کیا ہے۔ اور اس کے ساتھ یہ کتابیں جو تھیں میں نے کہا اس کے ساتھ دو تین درجن کتابیں بھی، آپ دیکھ لیجیے کہ یہ بھی میں نے لکھیں۔ تو یہ صورت تھی۔ میں ان کے لیے کچھ چائے وائے کا کہنے کے لیے اندر گیا۔ میں باہر آیا تو میں نے دیکھا کہ وہ وہاں سے جا رہے تھے۔ مجھے بڑی حیرت بھی ہوئی اور کچھ رنج بھی ہوا کہ اس شخص نے جاتے وقت اتنا بھی نہیں ایٹیکیٹ Etiquette برتا۔ میں نے چائے کا پوچھا' کہا نہیں۔ کچھ دنوں کے بعد وہ جو دوسرے آفیسر تھے، وہ جاننے والے تھے میرے۔ میں نے ان سے پوچھا، میں نے کہا کیا بات اُس دن ہوئی تھی؟ کہنے لگے تم جو اندر گئے ہو ناں تو وہ مجھ سے کہنے لگا کہ یہ شخص غلط بیانی سے کام لے رہا ہے، یہ تنہا کر سکتا ہے کوئی آدمی۔ تو میں ہی نہیں عزیزم، وہ تو کوئی بھی جس کے سامنے یہ بات آئے، وہ کہتا ہے کہ پرویز صاحب یہ بات نہیں۔ لیکن میری زندگی اب تو بہرحال آپ احباب کے سامنے ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ کوئی اور ہے نہیں۔ یہ بات کہ یہ کیسے کر لیا، میں کیا عرض کروں۔ ٹھیک کہا ہے آپ نے تیس سالہ میں نے ملازمت کی' طلوعِ اسلام نکل رہا ہے باقاعدہ' اور پھر یہاں آنے کے بعد درس باقاعدہ ہو رہے ہیں۔ تیس سال سے آپ کے سامنے ہے' بزم میں اتنی بنی ہوئی ہیں' ادارہ ہے ہمارے ہاں کا، اُس کو بھی دیکھنا ہوتا ہے' خط و کتابت بھی ہے' استفسارات بھی ہیں' ملاقاتی بھی ہیں' گھر بھی ہے' یہ سب کچھ۔ اور صحت میری کہ وہ ساری میز میری دوائیوں سے بھری ہوئی ہوتی ہے۔ لیکن اُس کے باوجود یہ بات میں خود بھی نہیں بتا سکتا سوائے اس کے کہ وہ یہی چیز جو غالب کہہ گیا ہے کہ ؎

بے دست و پا نیم کہ ہنوز از وفورِ عشق
سودائے در سرم کہ بہ ساماں برابر است

مقصد کے ساتھ میں سمجھتا ہوں اگر لگن اور عشق ہو جائے انسان کو، خود پتہ نہیں ہوتا کہ اُس کے اندر کتنی توانائیاں ہیں مضمر۔ اور وہ نکلتی چلی آ رہی ہیں، نکلتی چلی جاتی ہیں۔ یہ تو کچھ اٹامک انرجی اس کے اندر ہوتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب یہ ہوا۔

مجھ سے میری ملازمت کے متعلق پوچھا گیا ہے اور میں معاملاتِ دنیا کی طرف کیا آؤں۔ ملازمت تو معاشی ضرورت تھی میری' ہمارے پاس کوئی اور ذریعہ معاش نہیں تھا۔ تو یہ دادا جان کا احسان تھا کہ انہوں نے مجھے ملازمت دلا دی۔ پہلی ملازمت میری لاہور میں ہوئی، عمر چھوٹی سی مختصر سی۔ اُس عمر میں پوسٹ آفس کے دفتر میں۔ اُس کے بعد، شروع سے ہی انگریز کے بہت خلاف تھا میں۔ لیکن کہیں کوئی ایسی جگہ نہیں ملتی تھی۔ کسی نے کہا کہ وہ ایک اسلامی ریاست ہے وہاں مسلمانوں کی ریاست ہے، میں نے سمجھا ریاست ہے وہاں' اُدھر جاب کے لیے وہاں چلا گیا۔ تو وہاں تو سوال ہی نہیں وہ تو ریاست تھی۔ یہاں سے میں نے پبلک سروس کمیشن کا امتحان دیا، سنٹرل گورنمنٹ تھی اور یہاں میری بڑی پوزیشن تھی۔ تو 1926ء میں مَیں سنٹرل گورنمنٹ میں چلا گیا اور وہاں اس کے بعد میری پوسٹنگ اسٹیبلشمنٹ ڈیپارٹمنٹ میں ہوئی۔ اور عجیب چیز ہے یہ بھی، میں نے کہا ہے ناں کہ اتفاقات محض میرا ساتھ دے رہے ہیں۔ اسٹیبلشمنٹ کا جو شعبہ میرے ذمے لگا۔ اُس زمانے میں پہلی دفعہ قانون پاس ہوا کہ مسلمانوں کو سروس میں 25% حصہ ملے گا اور یہ شعبہ بھی میرے ذمے آ گیا کہ میں دیکھوں کہ

مسلمانوں کو مل رہا ہے۔ ہندو کے منہ سے یہ لقمہ چھیننا اور مسلمانوں کو پچیس فیصد دلانا، یہ میری آفیشل ڈیوٹی ہوگئی۔ ہندو بہرحال مجھے اورنگا کہا کرتے تھے اُس دَور میں۔ یہ لمبی داستان ہے کہ وہ بتیس دانتوں میں زبان کی طرح کیسے رہا میں۔ لیکن اللہ کا شکر ہے کہ کوئی ایک چیز میرے خلاف اُس سارے دوران میں نہیں ہوئی ہے۔ اور ہر شخص معترف تھا کہ یہ شخص کچھ بھی ہوجائے قانون کی خلاف ورزی کبھی نہیں کرے گا، نہ کسی کے خلاف جانے میں، نہ کسی کی حمایت کرنے کے اندر۔ یہ میرے متعلق وہاں مشہور تھا۔ اُس زمانے میں بڑا پاپولر تھا میں سیکریٹریٹ کے اندر۔ ہوم ڈیپارٹمنٹ میں رہنے کی وجہ سے اور چیز بھی میرے حصے میں آئی۔ یہ تو تھا نا آفیشل جو محکمہ تھا۔ انٹرنل پالیٹکس سارا ہوم ڈیپارٹمنٹ میں ہوا کرتا تھا اور ہمارے ہاں جتنے بھی تھے یہ مسلم لیگ والے، اُن کے ساتھ میرے تعلقات تھے۔ ایک وقت آیا تھا جب میں نے کہا ملازمت چھوڑ دوں تو قائداعظمؒ نے کہا کہ بالکل نہیں۔ ہم تو ان سیکریٹریٹ کی دیواروں کے سائے تلے سے بھی نہیں چل سکتے، تم اندر بیٹھے ہوئے ہو۔ اس سے بھی ایک فائدہ تھا کہ یہ چیزیں میرے سامنے ضمناً آجاتی تھیں۔ یہاں سیکریٹریٹ کی مسجد کا میں امام بھی، خطیب بھی تھا، درس وغیرہ دیا کرتا تھا۔ یہ چیز بھی میں بعد میں بتاؤں گا جب میں آؤں گا تحریکِ پاکستان کے ضمن میں کہ مَیں نے کیا کیا اور کیسے کیا اور اس میں رہتے ہوئے کیسے کیا صاحب۔ تو میں سن 1955ء تک وہاں رہا اور اس کے بعد پھر میں نے یہ سوچ لیا کہ اب مجھے اپنا زندگی کا بقایا وقت اپنے مشن کی نذر کردینا چاہیے۔ تو میں نے قبل از وقت پنشن لے لی تھی 1955ء میں۔ جتنی سروس کی میں نے اتنا وقت تو پنشن کا بھی ہوگیا۔ تو یہ اگرچہ مجھے وہ چھوڑتے نہیں تھے۔ میں نے جیسا عرض کیا ہے کہ مسلمانوں میں اس لیے مقبول تھا کہ میں ان کی ملازمت میں جو Vacancies کا حصہ تھا، اس کا تحفظ میرے ذمے تھا۔ اور وہ جو بھی کسی کے اوپر مشکل آکے پڑتی تھی اور مسلمانوں پہ تو ہر وقت پڑا کرتی ہیں، وہ سارا میں مرکز تھا سیکریٹریٹ کے اندر مسلمانوں کی ان تمام مشکلات کے حل کے لیے۔ ان کی دشواریوں میں' ان کی مدد کرنے کے لیے قانونی طور پر Formally جو کچھ ہوسکتا تھا۔ وہ مرکز میں ادھر میں یہ تھا اور وہ میں آگے چل کے بتاؤں گا اگلی دفعہ وہ تحریک پاکستان کا جب دور آئے گا جب میں عرض کروں گا تو پھر میں عرض کروں گا کہ اس کے ساتھ، تحریک کے لیے کیا کرتا تھا۔ اب یہ بات کہ ملازمت کرتے ہوئے بھی وقت کیسے نکالتا تھا۔ میں نے کہا ملازمت کو تو دینا ہی پڑتا تھا یہ وقت جتنا بھی ہے۔ اب وقت نکالتا کیسے تھا؟ میں نے عرض کیا ہے ناں کہ یہاں پہنچ کر میرے دلائل بھی جواب نہیں دے سکتے۔ نکالا یہ وقت۔ اور وہ اسی طرح سے وہ لگن جب ہوتی ہے تو پھر ہے۔ اگر اجازت ہو تو ایک ذاتی بات کرلوں۔ اس میں بہت بڑا حصہ میری ہمسر بیوی کا بھی ہے۔ انہوں نے بڑی رفاقت سے کام لیا ہے۔ مجھے انہوں نے معاملاتِ دنیا سے فارغ کردیا۔ اُس میں انہوں نے بالکل درویشانہ استغناء سے زندگی بسر کی۔ کبھی یہ نہیں کہ تم سارا وقت اس کے اندر صرف کرتے چلے جاتے ہو، کچھ اور نہیں۔ ٹھیک ہے معاملات کو بھی میں دیکھتا تھا۔ لیکن جو اتنا وقت صَرف ہوجاتا ناں، گھر والوں میں انہوں نے مجھے اس سے فارغ کردیا ہوا تھا۔ یہ بہت بڑا احسان ہے اُس کا۔ باقی یہ رہا کہ ملازمت کے باوجود وقت اتنا کیسے نکل آتا تھا۔ میں نے کوئی وقت ضائع ہی

نہیں کیا۔ اگر کوئی مقصد آپ کے سامنے ہو اور اس کے ساتھ آپ کو قلبی لگن اور عشق لگا ہوا ہو پھر نہ ملازمت آڑے آتی ہے، نہ گھر بار آڑے آتا ہے۔ کوئی چیز نہیں آڑے آتی، مقصد کا عشق سب کچھ کر دیتا ہے۔ عزیزانِ من! یوں ملازمت میں مَیں نے سورج کی کرنوں سے چھین کے وقت لے لیا تھا۔ اور وقت ہی میرے پاس کنجی اور Asset تھا کوئی اور Asset نہیں تھا میرے پاس اُس وقت' کہیں سے کوئی آمدنی نہیں تھی۔ اسی پہ گزارا ہوتا تھا۔ جو کچھ بھی طلوع اسلام تحریک کے لیے کرتا تھا ، وہ اسی سے ہوتا تھا، کہیں اور سے کوئی اور مدد نہیں مجھے ملی۔ نہ میں نے حاصل کی، نہ کسی نے دی آج تک۔ تو ملازمت میں تو یہ کیا۔ پنشن لے لی میں نے اتنی سی اور اس سے یونہی چلا جا رہا ہوں۔

انجینئر مرزا محمد خلیل (ناظم ادارہ طلوعِ اسلام)

سوال: مسلمانوں کا جذبۂ محرکہ کیا تھا یعنی یہ کہ ہم نے پاکستان کیوں مانگا تھا اس کے متعلق بھانت بھانت کی بولیاں بولی جاتیں ہیں کوئی کہتا ہے کہ ہندوؤں کی تنگ نظری تھی جس سے مجبور ہو کر ہم نے علیحدگی اختیار کرنے کا فیصلہ کیا تھا کہیں سے آواز آتی ہے کہ یہ صرف انگریز کی سکیم تھی کوئی کہتا ہے کہ یہ معاشی مسئلہ تھا۔ مسلمان سرمایہ دار متحدہ ہندوستان میں اپنی سرمایہ کاری کے لئے گنجائش نہیں دیکھتے تھے اس لئے اُنہوں نے اس سکیم کا Idea تجویز کیا تھا۔ آپ اس تحریک میں عملاً شریک تھے اور شریک بھی بڑی نمایاں حیثیت سے۔ کیا آپ یہ بتائیں گے کہ اس سکیم کا جذبۂ محرکہ کیا تھا۔ آپ نے پاکستان کا مطالبہ کیوں کیا؟

پرویز صاحب:

خلیل صاحب! یہ جنتی توجیہات پیش کی جاتی ہیں اور آپ نے انہیں دہرایا ہے، یہ سب افسانے ہیں جنہیں خاص مقاصد کے تحت تراشا گیا اور مشہور کیا جا رہا ہے۔ حقیقت اس کے خلاف ہے۔ اور اس حقیقت کو پھر خاص مصالح کے تابع چھپایا گیا، دبایا گیا اور کہنے دیجیے کہ دفنایا گیا۔ اور اس کے بعد، میں اس کے مزار پر تنہا متولی فاتحہ خوانی کے لیے زندہ ہوں۔ اور

غم سے مرتا ہوں کہ دنیا میں نہیں اتنا کوئی
کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا میرے بعد

لیکن یہ چیز پھر ڈھارس بندھاتی ہے کہ

مجھے فکرِ جہاں کیوں ہوں
جہاں تیرا ہے یا میرا

میں اس حقیقت کو طلوعِ اسلام کے پہلے دَور سن 1938ء سے اُس وقت سے، میں نے بیان کرنا شروع کیا اور اب 35 سال سے مسلسل اور متواتر پاکستان میں اسے دہرائے چلا جا رہا ہوں۔ اس سلسلے میں دو بنیادی نکات ذہن نشین کیجیے۔ ایک تو یہ کہ میں نے جو کچھ سن 1938ء میں کہا تھا، وہی کچھ سن 1982ء میں کہہ رہا ہوں۔ کسی جگہ بھی کہیں کوئی تضاد آپ کو نظر نہیں آئے گا۔ اور اس کی وجہ یہ کہ میں جو کچھ کہتا ہوں، اس کی بنیاد قرآن ہوتی ہے۔ اور قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ میرے منزل من

اللہ ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ مجھ میں کہیں تضاد نہیں ہے۔ دوسری یہ چیز کہ جو کچھ میں کہتا ہوں بغیر اتھارٹی اور حوالے کے نہیں کہتا، مستند حوالے ہوتے ہیں۔ میرے مخالفین نے میرے خلاف اور سب کچھ کہا لیکن آج تک کسی نے میرے کسی حوالے کو چیلنج نہیں کیا۔ آج بھی جو کچھ میں عرض کروں گا، مستند حوالوں سے کروں گا۔ اگرچہ اس کی ضرورت نہیں ہوگی کہ میں ایک ایک حوالہ بھی ساتھ بیان کرتا چلا جاؤں۔ یہ جو ہے کہ یہ ہندو کی تنگ نظری تھی تو یہ تو چار ہی قدم آگے چل کے میں عرض کروں گا کہ ہندو نے اس کی مخالفت کیوں تھی۔ بات کچھ اور کی کچھ اور، آپ کے سامنے آئے گی۔ جہاں تک انگریز کا تعلق ہے کہ یہ اس کی اسکیم تھی، پہلے تو خیر خود بھی یہ چیز ابہام میں تھی کچھ شکوک تھے۔ اب ماؤنٹ بیٹن کی ڈائری کے اوراق شائع ہونا شروع ہوئے اور انڈیا آفس لائبریری کی مخفی دستاویز بھی Publish ہوگئیں تو ان کے ذریعے یہ حقیقت نمایاں ہوگئی کہ وہ تو آخری لمحے تک انگریز اس کی مخالفت کرتا رہا۔ ابھی پچھلے دنوں جو وہ آخری چیز سامنے آئی دستاویز میں، اُس میں یہ تھا کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن یہاں جناحؒ کی اس (بقول اس کے) ضد سے تنگ آ کر کہ وہ ''نہ ہی نہ'' کہے چلا جا رہا تھا، آخری دنوں میں ولایت پہنچا' لندن میں اُس نے مشورے کیے اور چرچل سے بھی مشورہ کیا حالانکہ وہ حزبِ مخالف کا لیڈر تھا اُس زمانے میں۔ چرچل نے اُس سے کہا کہ اس قسم کے ضدی آدمی کا علاج دھمکی ہوتا تھا Threat ہوتا ہے اُسے Threat دو۔ ماؤنٹ بیٹن نے کہا کہ اگر وہ Threat سے نہ مانا اور مجھے ایسا نظر آتا ہے تو وہ نہیں مانے گا۔ تو چرچل نے کہا کہ پھر ملک کو تقسیم کر کے گھر واپس آ جاؤ اور کیا کیا جا سکتا ہے۔ انگریز کی اسکیم تھی!!!

باقی رہا کہ یہاں کے سرمایہ داروں کی یہ اسکیم تھی یا ان کا آئیڈیا دیا ہوا تھا کہ وہ سمجھتے تھے کہ یہاں پہنچنے کے بعد پتہ نہیں کتنی بڑی Capitalistic ایک سٹیٹ ہوگی۔ تو اس کے متعلق مجھ سے کچھ نہ پوچھیے، 1947ء میں دہلی میں آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس میں صدارتی خطاب میں قائداعظمؒ نے جاگیرداروں' زمینداروں' سرمایہ داروں کو مخاطب کیا تھا۔ یاد رہے کہ اُس زمانے میں ان لوگوں کو ساتھ رکھنے کی بڑی ضرورت تھی، لیکن یہ تو مردِ بے باک تھا۔ انہوںؒ نے کہا تھا کہ:۔

> ''اس مقام پر میں زمینداروں اور سرمایہ داروں کو بھی متنبہ کرنا چاہتا ہوں۔ وہ ایک ایسے فتنہ انگیز ابلیسی نظام کی رُو سے جو انسانیت کو ایسا بدمست کر دیتا ہے کہ وہ کسی معقول بات کے سننے کے لیے آمادہ ہی نہیں ہوتا، عوام کے گاڑے پسینے کی کمائی پر رنگ رلیاں مناتے ہیں' عوام کی محنت کو غصب کر لینے کا جذبہ ان کے رگ و پے میں سرایت کر چکا ہے۔ میں اکثر دیہات میں گیا ہوں۔ میں نے دیکھا ہے کہ وہاں بھی بندگانِ خدا ایسے ہیں جنہیں ایک وقت بھی پیٹ بھر کر روٹی نہیں ملتی۔ کیا اسی کا نام تہذیب ہے' کیا یہی پاکستان کا مقصود ہے۔ اگر پاکستان کا یہی مقصود ہے تو میں ایسے پاکستان سے باز آیا۔ اگر ان سرمایہ داروں کے دماغ میں ہوش کی ذرا سی بھی رمق باقی ہے تو انہیں زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے ساتھ چلنا ہوگا۔ اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو ان کا خدا حافظ ہم ان کی کوئی مدد نہیں کر سکیں گے۔''

اور دو ہی سال پہلے انہوں نے کلکتہ میں مسلم لیگ ورکرز سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ:۔

''میں ایک بوڑھا آدمی ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے مجھے اتنا دے رکھا ہے کہ میں اپنے اس بڑھاپے کی زندگی کو نہایت آرام اور سہولت سے گزار سکتا ہوں۔ مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ میں دن رات بھاگے بھاگے پھروں اور اپنا خون پسینہ ایک کردوں۔ میں یہ تگ و تاز سرمایہ داروں کے لیے نہیں کر رہا۔ میں یہ محنتِ شاقہ آپ غریبوں کے لیے کر رہا ہوں۔ میں نے ملک میں دردانگیز مفلسی کے مناظر دیکھے ہیں۔ ہم کوشش کریں گے کہ پاکستان میں ہر فرد خوشحالی کی زندگی بسر کرے اور وہاں نظامِ سرمایہ داری باقی نہ رہے۔''

اس کا بھی جواب آپ نے سن لیا۔

اب یہ ہے کہ وہ حقیقت کیا تھی؟ اتفاق سے اس کے لیے بھی قائداعظمؒ کے الفاظ میرے سامنے آ گئے۔ انہوںؒ نے 1944ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں پاکستان کے مطالبہ کے محرکات کو تفصیل سے بیان کرنے کے بعد کہا تھا کہ آپ نے غور فرمایا کہ پاکستان کے مطالبہ کا جذبہء محرکہ کیا تھا' مسلمانوں کے لیے ایک جداگانہ مملکت کی وجہء جواز کیا تھی' تقسیم ہند کے مطالبہ کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اس کی وجہ نہ ہندوؤں کی تنگ نظری ہے نہ انگریزوں کی چال، یہ اسلام کا بنیادی مطالبہ ہے۔ آپ نے غور فرما لیا کہ جذبہء محرکہ کیا تھا۔ بات تو ایک لفظ میں سامنے آ گئی ''یہ اسلام کا بنیادی مطالبہ ہے''۔ اور یہیں سے جو سوال پھر سامنے آتا ہے کہ اس مطالبہ کی مخالفت انگریز نے کی، ہندو نے کی، وہ قابلِ فہم ہے۔ لیکن ان دونوں سے زیادہ شدید مخالفت وہاں نیشنلسٹ علماء نے کی۔ تو علماء تو بہرحال الحاد و دہریت کے مدعی تو نہیں تھے، وہ بھی تو اسلام کے مدعی تھے۔ تو یہ کیا بات ہے؟ یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ اسلام کا بنیادی مطالبہ ہے جو ہم پیش کر رہے ہیں۔ وہ اسلام کے داعی اور مدعی ہیں تو ان دونوں میں ٹکراؤ کیوں ہے؟ انہوں نے اس کی مخالفت پھر کیوں کی؟ یہ نکتہ سمجھ میں آ جائے تو یہ ساری توجیہات سمجھ میں آ جاتی ہیں اور پھر یہ کہ وہاں یہ کشمکش کیا تھی' یہ مخاصمت کیا تھی، یہ مخالفت کیا تھی؟ اس ایک نکتے میں یہ ساری چیزیں پنہاں ہیں۔ اور وہ نکتہ یہ ہے کہ اسلام کا ایک تصور ان علماء حضرات کے ذہن میں تھا اور اسلام کا دوسرا تصور علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ کے ذہن میں تھا۔ یہ جنگ تھی ان دو تصورات کی۔ اس کے لیے جو اِن علماء حضرات کا تصور تھا، اس کے لیے مذہب کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ یہ خود بھی اُسے مذہب ہی کہتے تھے، دین کبھی نہیں انہوں نے کہا۔ اقبالؒ نے جو پیش کیا اُس نے کہا کہ اسلام مذہب نہیں، اسلام دین ہے۔ مذہب کا تو لفظ ہی سارے قرآن میں کہیں نہیں آیا۔

تو اصل بات اب یوں ٹھہری کہ ہمیں دیکھنا چاہیے کہ مذہب اور دین میں فرق کیا ہے؟ اور جب یہ فرق سامنے آ جائے گا تو پھر یہ بھی پتہ چل جائے گا کہ انہوں نے مخالفت کیوں کی تھی اور یہ مخاصمت جو تھی اتنے عرصے تک کیوں جاری رہی تھی۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھیے کہ مذہب نام ہے خدا اور بندے کے درمیان ایک پرائیویٹ سے تعلق کا جسے ہر شخص پوجا پاٹ' گیان دھیان' بھگتی' پرستش' رسوم و رواج اور ارکان' ان کے ذریعے سے قائم کرتا ہے اور وہ انفرادی اور ذہنی ہوتا ہے۔ یعنی وہ شخص ہی

جانتا ہے کہ یہ قائم ہوگیا ہے یا نہیں ہوگیا، اُس کا کچھ ثبوت نہیں ہوتا وہ سمجھ لیتا ہے اور مطمئن ہوجاتا ہے۔ امورِ دنیا سے اس کو کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ یہ چیز ہے جسے مذہب کہا جاتا ہے۔ آج یہ سیکولرازم جو ہے مذہب کی جو اجازت اس میں ملتی ہے، وہ یہ مذہب ہوتا ہے۔ اب اس کے مقابلے میں دین ہے۔ مذہب کے متعلق میں نے عرض کیا ہے کہ یہ خدا اور بندے کے درمیان ایک تعلق کو قائم کرتا ہے جو انفرادی ہوتا ہے۔ کہنے دیجیے کہ دین، انسان اور انسان کے مابین جو تعلق ہے اس کو نہایت حسن کارانہ انداز سے استوار کرتا ہے جس سے یہ زندگی جنت بن جاتی ہے۔ اور یہ تعلق استوار ہوتا ہے ایک نظام کے تابع' اُسی نظام کو اسلامی مملکت بھی کہتے ہیں۔ وہ زندگی کے ہر گوشے کو محیط ہوتی ہے' اس میں انفرادی اور اجتماعی کا بھی کوئی فرق نہیں ہوتا' اس میں وحی کے ذریعے سے جو اقدار (Values) اصول، غیر متبدل حدود یہ جو دی گئی ہیں انہیں نافذ کیا جاتا ہے اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق اُمت کے باہمی مشورے سے۔ دین کے لیے اپنی آزاد مملکت کا ہونا ناگزیر لاینفک ہے۔ اگر یہ نہیں ہے تو دین نہیں ہے، یہ پھر مذہب باقی رہ جاتا ہے۔ اس اسلامی مملکت میں یا اسلامی نظام کی خصوصیات کیا ہیں، یہ میں آگے چل کے بیان کروں گا جب یہ سوال آئے گا کہ اسلامی مملکت کسے کہتے ہیں اور وہ کیوں قائم کی جاتی ہے اور اس کے نتائج کیا ہوتے ہیں۔ میں یہاں صرف دو چار اصولی باتیں عرض کروں گا کہ سب سے پہلے یہ کہ اس مملکت کی بنیاد اس پہ ہے کہ کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ دوسرے انسان پر حکومت کرے۔ حکومت کا حق صرف خدا کو ہے اور اس کا عملی ذریعہ اس کی کتاب ہے۔ اس کی کتاب میں جو اصول و اقدار دیے گئے ہیں وہ وہ حدود مقرر کرتی ہیں جن کے اندر رہتے ہوئے اُمت اپنے دَور میں اپنے دَور کے تقاضوں کے مطابق، طریقے وضع کرتی ہے۔ دوسری خصوصیت اس میں یہ ہوتی ہے کہ تمام افراد کے رزق کی ذمہ داری مملکت کے سَر ہوتی ہے۔ اُس میں کوئی فرد رات کو بھوکا نہیں سوتا۔ اور یہ جو کچھ مملکت کی طرف سے ملتا ہے، وہ خیرات نہیں ہوتی۔ خیرات کے متعلق تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ خیرات سے انسان کا قلب مردہ ہوجاتا ہے۔ یہ انہیں As of right لیتے ہیں، اپنے حق کے طور پر لیتے ہیں۔ یا یوں کہیے کہ مملکت کی ذمہ داری ہوتی ہے اور وہ اپنی ذمہ داری کو پورا کرتی ہے جب وہ افرادِ مملکت کی تمام ضروریاتِ زندگی کو پورا کرتی ہے۔ یہ دوسری خصوصیت اس میں ہوتی ہے۔ ان دو خصوصیات میں آپ نے دیکھا۔ پہلی خصوصیت کسی انسان کو حق حاصل نہیں کسی انسان پر حکومت کرے۔ ملوکیت ختم ہوگئی' آمریت ختم ہوگئی' ڈکٹیٹرشپ ختم ہوگئی۔ یہ چیز کہ اُمت باہمی مشاورت سے قرآن کے احکام و اصول کو نافذ کرنے کے طریقے وضع کرتی ہے۔ اسی کو قانونِ شریعت کہا جاتا ہے، مذہبی پیشوائیت ختم ہوگئی درمیان میں سے ہی نہیں۔ یہ چیز کہ ہر فرد کو اُس کی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کی ذمہ داری مملکت کے سَر ہے، نظامِ سرمایہ داری ختم ہوگیا۔ تو اس کی بنیادی خصوصیت ہی یہ ہے کہ انسانوں کی حکومت' نظامِ سرمایہ داری' نظامِ پیشوائیت' ان کو ختم کر دیا۔ یہ تھی وہ مملکت جو صدرِ اول میں قائم ہوئی رسول اللہ ﷺ والذین معہٗ کے مقدس ہاتھوں سے۔ اس کا نام دین تھا۔ قرآن نے اسے الدین بھی کہا ہے۔ مجھے جلدی سے آگے بڑھنا چاہیے۔

کچھ عرصے کے بعد یہ نظام باقی نہ رہا اور ملوکیت پھر سے آ گئی۔ انسانوں نے قوت کے زور پر اقتدار پر قبضہ کرلیا۔

بہرحال اُمت تو مسلمان تھی، اسلام کا ان کے سینے میں درد تھا۔ اس کی ضرورت پیش آئی ان ملوکیت والوں کو کہ اسلام کو ساتھ رکھا جائے۔ انہوں نے ثنویت یا Dualism پیدا کی امورِ مملکت اپنے ہاتھ میں رکھے اور یہ عقائد: نماز روزہ حج زکوٰۃ جنہیں آج ارکانِ اسلام کہا جاتا ہے یا Personal Laws: نکاح طلاق عدت وغیرہ کے مسائل، یہ چیزیں انہوں نے علماء کے سپرد کریں۔ یہ ان کا مذہب ہوا۔ مذہب امورِ دنیا میں یا مملکت میں دخل نہیں دیتا تھا، مملکت ان کی سلطنت میں دخل نہیں دیتی تھی۔ دونوں اپنی اپنی جگہ اپنی مملکتوں کے حاکم تھے۔ یہ اسلام نہیں تھا یہ دین نہیں تھا، اِن کے ہاں مذہب تھا اور وہ خالص سیکولر تھے۔ یہی چیز چلی آ رہی تھی تیرہ سو سال یا ہزار سال سے مسلمانوں کے اندر۔ اس کے خلاف اقبالؒ نے سب سے پہلے ہمارے ہاں آواز اٹھائی۔ اُس نے کہا کہ یہ جو کچھ انڈیا میں تو بہرحال انگریز کے دَور میں وہی ملوکیت تھی انگریز کی اور وہی مذہب تھا جس کی انہوں نے اجازت دے رکھی ہوئی تھی۔ تو اقبالؒ نے یہ بات کہی کہ یہ مذہب ہے جس کی اجازت وہاں مل رہی ہے۔ دین کے لیے اپنی الگ مملکت کا ہونا ناگزیر ہے۔ اور اس کے لیے ابتداً ہمیں ایک ایسا خطۂ زمین لینا چاہیے جہاں پہلے سے کوئی نظام اسلامی قائم نہ ہو، تاکہ ہم اس میں نئے سرے سے پھر اُس صدرِ اول کا جو دین ہے، اس کو قائم کر سکیں۔ یہ چیز تھی جسے وہ پہلے تو شدہ شدہ پیش کرتے رہے۔ 1930ء میں انہوں نے جوالہ آباد کے مقام پہ مسلم لیگ کا جو صدارتی خطبہ دیا تھا اُس میں یہ چیز انہوں نے واضح کی کہ مقصد یہ ہے کہ وہ جو ملوکیت کا پیدا کردہ مذہب ہے، اُس کی جگہ قرآن کا دین Establish کیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے اُس خطبے میں جو بات کہی تھی وہ بڑا اہم خطبہ ہے۔ جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ ان حقیقتوں کو بھلایا گیا، دفنایا گیا۔ یہ چیزیں آپ دیکھیں گے اقبالؒ کے اور قائداعظمؒ کے دن منائے جاتے ہیں، مذاکرات ہوتے ہیں، کتابیں لکھی جاتی ہیں۔ سب کچھ ہو رہا ہے یہ باتیں نہیں کہی جاتیں۔ انہوں نے کہا یہ تھا کہ:۔

> ''اس مملکت کے قیام سے (جس کا مطالبہ وہ کر رہے تھے) اسلام کو اس امر کا موقع ملے گا کہ وہ ان اثرات سے آزاد ہو کر جو عربی ملوکیت کی وجہ سے اب تک اس پر قائم ہیں، اس جمود کو توڑ ڈالے جو اس کی تہذیب و تمدن، شریعت اور تعلیم پر صدیوں سے طاری ہے۔ اس سے نہ صرف اس کی صحیح معنوں میں تجدید ہو سکے گی بلکہ وہ زمانۂ حال کی رُوح سے بھی قریب تر ہو جائیں گے۔''

تو پہلی ضرورت اس مملکت کی یہ تھی کہ ملوکیت کے دَور کا جو مذہب تھا اُس کو الگ کر کے اُس کی جگہ قرآن کا دین یہاں نافذ کیا جائے۔

اب اس کے راستے میں سب سے پہلے اُن کو پتہ تھا کہ مولانا حضرات آئیں گے، مذہبی پیشوائیت آئے گی۔ علامہ اقبالؒ نے 1932ء میں آل انڈیا مسلم کانفرنس کے سالانہ اجلاس منعقدہ لاہور میں قوم سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ:۔

> ''تمہارے دین کی یہ بلند فکری علماؤں اور فقیہوں کے فرسودہ اوہام میں جکڑی ہوئی ہے اور آزادی چاہتی ہے۔ روحانی اعتبار سے ہم حالات اور جذبات کے ایک قید خانے میں محبوس ہیں جسے صدیوں کی مدت میں ہم

نے اپنے گرد خود تعمیر کر رکھا ہے۔ ہم بوڑھوں کے لیے شرم کا مقام ہے کہ ہم نوجوانوں کو ان اقتصادی، سیاسی بلکہ مذہبی بحرانوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ بنا سکے جو زمانۂ حاضر میں آنے والے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ساری قوم کی موجودہ ذہنیت کو یکسر تبدیل کر دیا جائے تاکہ پھر وہ نئی آرزوؤں، نئی تمناؤں اور نئے نصب العین کی روح کو محسوس کرنے لگ جائے۔ اور اس کے لیے اس چنگل سے آزادی حاصل کرنا ضروری ہے۔''

یہ تھا جوان کے سامنے تھا۔ علامہ اقبالؒ کے بعد قائداعظمؒ تشریف لاتے ہیں۔ دین اور مذہب کے فرق کو انہوں نے جس خوبصورتی سے اور جامعیت سے بیان کیا ہے جب انسان اس پہ غور کرتا ہے تو بصیرت وجد میں آ جاتی ہے۔ عام طور پر قائداعظمؒ کے متعلق یہی مشہور کیا گیا ہے کہ وہ ولایت پلٹ مسٹر، ایک بیرسٹر اسے کیا پتا کہ اسلام کیا ہوتا ہے۔ سنیئے قائداعظمؒ مذہب اور دین کے فرق کو کس خوبصورتی سے بیان کرتے ہیں۔ انہوں نے اگست 1941ء میں حیدرآباد دکن میں طالب علموں کے سوال کے جواب میں کہ ''مذہب اور مذہبی حکومت کے لوازم کیا ہوتے ہیں'' کہا تھا کہ:۔

''جب میں انگریزی زبان میں مذہب یعنی Religion کا لفظ سنتا ہوں اور انگریزی زبان کی کوتاہ دامنی کہ وہاں لفظ ہی دوسرا ہے نہیں اس لیے کہ دین کا Concept ان کے ذہن میں ہی نہیں ہے کہ جب میں مذہب کا لفظ سنتا ہوں تو اس زبان اور محاورے کی رُو سے میرا ذہن لامحالہ خدا اور بندے کے باہمی پرائیویٹ تعلق کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ لیکن میں خوب جانتا ہوں کہ اسلام کے نزدیک مذہب کا یہ محدود اور مقید مفہوم نہیں۔ میں نہ کوئی مُلا ہوں نہ مولوی، نہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعویٰ ہے البتہ میں نے قرآنِ مجید اور قوانینِ اسلام کے مطالعہ کی اپنے طور پر کوشش کی ہے۔ اس عظیم کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔ زندگی کا رُوحانی پہلو ہو یا معاشرتی، سیاسی ہو یا معاشی، غرضے کہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطہ سے باہر ہو۔ قرآنِ کریم کے اصولی ہدایات اور طریقِ عمل نہ صرف مسلمانوں کے لیے بہتر ہیں بلکہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے لیے حسنِ سلوک اور آئینی حقوق کا جو حصہ ہے اس سے بہتر تصور نہیں کیا جا سکتا۔''

انہوں نے 1945ء میں ملت کے نام پیغام میں ایک عظیم حقیقت کی نقاب کشائی کی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ:۔

''اس حقیقت سے ہر مسلمان واقف ہے کہ قرآن کے احکام مذہبی اور اخلاقی حدود تک محدود نہیں۔ مشہور مؤرخ گبن نے ایک جگہ لکھا ہے کہ بحرِ اٹلانٹک سے لے کر گنگا تک ہر جگہ قرآن کو ضابطۂ ہدایت کے طور پر مانا جاتا ہے۔ اس کا تعلق صرف الٰہیات تک نہیں بلکہ وہ مسلمانوں کے لیے سول اور فوجداری قوانین کا ضابطہ ہے۔ جس کے قوانین نوعِ انسان کے تمام اعمال و احوال کو محیط ہیں اور یہ قوانین غیر متبدل، منشائے خداوندی کے مظہر ہیں۔''

گبن نے یہ بات کہی تھی اور اس اقتباس کے بعد وہ خود فرماتے ہیں کہ:۔

''اس حقیقت سے سوائے جہل اُ کے ہر شخص واقف ہے کہ قرآن مسلمانوں کا بنیادی ضابطۂ زندگی ہے۔ (آپ سمجھتے ہیں جہلاء کا مفہوم)۔ جو معاشرت' مذہب' تجارت' عدالت' فوج' دیوانی' فوجداری اور تعزیرات کے ضوابط کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ مذہبی تقاریب ہوں یا روزمرہ کے معمولات' روح کی نجات کا سوال ہو یا بدن کی صفائی کا' اجتماعی حقوق کا سوال ہو یا انفرادی واجبات کا' عام اخلاقیات ہوں یا جرائم' دنیاوی سزا کا سوال ہو یا آخرت کے مواخذہ کا' ان سب کے لیے اس میں قوانین موجود ہیں۔ اسی لیے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا تھا کہ ہر مسلمان قرآنِ کریم کا نسخہ اپنے پاس رکھے اور اس طرح اپنا مذہبی پیشوا آپ بن جائے انہیں الگ مذہبی پیشواؤں کی ضرورت نہیں رہے گی۔''

پوچھا گیا ان سے کہ اسلامی حکومت جس کے حصول کے لیے یا قیام کے لیے اس طرح آپ جدوجہد کر رہے ہیں' اس کی امتیازی خصوصیت یا منفرد خصوصیت کیا ہوگی؟ اس کے جواب میں جو کچھ انہوں نے کہا ہے میں نے اس سے پہلے بھی کہیں یہ عرض کیا تھا کہ یہ ایک پیراگراف یہ اس قدر جامع ہے کہ اسلامی مملکت کا پورا تصور اس کے اندر آجاتا ہے۔ اور میں گذارش کروں گا کہ میری نگاہ میں متقدمین نے جو بھی کچھ لکھا ہے حکومتِ اسلامی کے متعلق، متاخرین نے بھی اور ہمارے دور میں بھی کسی جگہ اس جامعیت سے یہ بات نہیں کہی گئی۔ اور اس کے بعد یہ بھی حقیقت ہے کہ آج تک میری زبان یا طلوعِ اسلام کے علاوہ آپ نے یہ چیز کہیں اور نہ سنی ہوگی نہ پڑھی ہوگی نہ دیکھی ہوگی۔ اب سنیے وہ کیا کہتے تھے کہ اسلامی حکومت کے بارے میں:۔

''اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہیے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے۔ (یہ تو ہر شخص کہتا ہے خدا کی ذات ہے وہ کہتے ہیں جس کی تعلیم کا واحد ذریعہ قرآنِ مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اب وہ Abstract کو محسوس دائرے میں لے آئے)۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ کسی پارلیمان کی نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآنِ کریم کے احکام ہی سیاست یا معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے۔ اور حکمرانی کے لیے آپ کو علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے ہم اس لیے مطالبہ کر رہے ہیں اس پاکستان کا۔''

کہیے عزیزانِ من! اس سے زیادہ واضح بین چیز کہیں اور آپ کو ملے گی۔ اب آئے ان کے سامنے مذہبی پیشوائیت یا مُلا۔ انہوں نے 1938ء میں علی گڑھ یونیورسٹی کے طلباء کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ:۔

''مسلم لیگ نے کم از کم ایک کام تو کر دیا ہے اور وہ یہ کہ اس نے تمہیں مسلمانوں کے رجعت پسند عناصر کے چنگل سے چھڑا دیا ہے اور اس خیال کو عام کر دیا ہے کہ جو لوگ خودغرضی کا مفاد پرستانہ کھیل کھیل رہے ہیں، وہ

قوم کے غدار ہیں۔ اُس نے بلا شک وشبہ تمہیں اُس ناخوش آئند غیر مطلوب عنصر کی جکڑ بندیوں سے آزاد کر دیا ہے جسے مولوی یا مولانا کہتے ہیں۔''

انہوں نے 1946ء میں دلی میں Muslim Legislature کی جو کنونشن ہوئی تھی، اُس کے آخری اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ اسے اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ ہم کس مقصد کے لیے لڑائی لڑ رہے ہیں، ہمارا نصب العین کیا ہے۔ ہمارا نصب العین تھیوکریسی نہیں ہم Theocratic State نہیں بنانا چاہتے، ہم قرآنی مملکت بنانا چاہتے ہیں۔ اور انہوں نے تشکیل پاکستان کے بعد بحیثیت گورنر جنرل فروری 1948ء میں امریکہ کے نام اپنے براڈ کاسٹ میں یہ کہا تھا کہ:۔

''پاکستان کی مجلسِ قانون ساز نے ابھی پاکستان کا دستور مرتب کرنا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس کی آخری شکل کیا ہوگی کچھ بھی ہو یہ مسلمہ بات ہے کہ پاکستان میں کسی صورت بھی تھیوکریسی رائج نہیں ہوگی۔ (اب آگے بتایا تھیوکریسی ہوتی کیا ہے؟ تھیوکریسی رائج نہیں ہوگی) جس میں حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے کہ وہ بزعمِ خویش خدائی مشن کو پورا کریں۔ پاکستان میں یہ نہیں ہوگا۔''

آپ سوچ لیجیے اس کے بعد کہ یہ دین جو اقبالؒ اور قائداعظمؒ پیش کر رہے تھے یہ مذہبی پیشوائیت کو کسی طرح بھی Suit کر سکتا ہے؟ انہوں نے اس کی تردید نہیں کی کہ آپ غلط کہتے ہیں۔ میں ابھی عرض کروں گا کہ اس میدان میں تو یہ میرے ذمہ تھا۔ بہرحال یہ نہیں انہوں نے کہا انہوں نے کہا، یہ کہ یہ جو کہتے ہیں کہ اسلام کے لیے ایک الگ مملکت کی ضرورت ہے، یہ مفروضہ ہی غلط ہے۔ اسلام کے متعلق انہوں نے کہا یہ یہی چیز جو میں نے ابھی عرض کی ہے۔ وہ اسلام کا تصور جو پیش کر رہے تھے یاد رکھیے ان کے مقابلے میں جو لوگ تھے وہ یہ یونہی پکی روٹی والے مُلا نہیں تھے، بہت بڑے علماء تھے۔ ان کا بڑا مقام تھا، ان کا بڑا نام تھا، مولانا ابوالکلام آزاد۔ علم کی دنیا میں ان کا نام لیتے ہوئے لوگوں کی نگاہیں جھک جاتی تھیں۔ مولانا حسین احمد مدنی: دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث، جمعیت علمائے ہند کے صدر۔ مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید۔ پورے دیوبند کے علماء بجز دو چار کے جنہوں نے تائید کی تھی مسلم لیگ کے مطالبہ کی، سب کے سب اس کے خلاف تھے۔ وہ کہتے کیا تھے؟ مولانا حسین احمد مدنی کا یہ قول ہے کہ ایسی جمہوری حکومت جس میں ہندو مسلمان سکھ عیسائی سب شامل ہوں، حاصل کرنے کے لیے سب کو متفقہ کوشش کرنی چاہیے ایسی مشترکہ آزادی اسلام کے اصول کے عین مطابق ہے اور اسلام اس آزادی کی اجازت دیتا ہے۔ اور اس کے بعد انہوں نے کہا کہ یہ حضرات یہ کہتے ہیں کہ ہمارا مطالبہ اور تحریک، اسلام کے تحفظ کے لیے ہے۔ کہا کہ کانگریس میں ہمیشہ ایسی تجاویز آتی رہتی ہیں اور پاس ہوتی رہتی ہیں جن کی وجہ سے مذہبِ اسلام کے تحفظ اور وقار کو ٹھیس نہیں پہنچ سکتی، محفوظ رہتا ہے۔ کانگریس کی طرف سے ہندوؤں کی طرف سے، انہوں نے کہا تھا کہ پنڈت جواہر لعل نہرو کے متعلق میں جانتا ہوں وہ دہرا چکا ہے کہ آپ کو اسلام کی پوری پوری آزادی حاصل ہوگی۔ کس اسلام کی آزادی حاصل ہوگی؟ وہی جو ملوکیت کے دَور کا مذہب چلا آ رہا تھا۔ اقبالؒ نے تو اسی لیے ایک شعر میں یہ بات کہہ دی تھی کہ

مُلا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

سجدے کی آزادی اور اسلام کی آزادی میں بڑا فرق ہے۔ یہ وہ اسلام تھا جو یہ حضرات پیش کرتے تھے اور اسی کو اقبالؒ عجمی اسلام کہہ کے پکارتا تھا کیونکہ عباسیوں کے دَور میں تو یہ وضع ہوا تھا لیکن اُس میں ایرانیوں کی ذہنیت اور ثقافت کا بڑا گہرا اثر تھا۔ اسی لیے مولانا حسین احمد مدنی سے جو آخری ''معرکۂ دین و وطن'' کے نام سے مشہور ہے زندگی کے آخری لمحات میں اقبالؒ نے بسترِ مرگ پر جو چیز کہی تھی کہ

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں، ورنہ
ز دیوبند حُسین احمد! ایں چہ بوالعجبی است
سرود بر سرِ منبر کہ مِلّت از وطن است
چہ بے خبر ز مقامِ محمدِ عربی است
بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی، تمام بولہبی است

مولانا حسین احمد کو یہ شخص کہتا ہے۔ میں اس مقام پہ ایک مغالطہ آفرینی کی نقاب کشائی ضروری سمجھتا ہوں۔ یہ بحث جب چلتی ہے ناں تو آخر میں یہ کہا جاتا ہے کہ آخر میں مولانا حسین احمدؒ نے اعتراف کرلیا تھا کہ میں نے یہ نہیں کہا تھا۔ میں نے جو کہا تھا، وہ یہ نہیں تھا۔ میں نے یوں کہا تھا۔ تو اقبالؒ نے کہہ دیا تھا کہ اگر تو آپ نے یہی کہا تھا جو آپ اب کہتے ہیں تو پھر مجھے کوئی اعتراض اس پہ نہیں ہے، میں آپ کی معذرت کو قبول کرتا ہوں۔ تو یہ کہتے ہیں کہ جب انہوں نے معذرت کو قبول کیا تو یہ اشعار بھی نقل نہیں ہونے چاہئیں، نکال دینے چاہئیں۔ بات تو ختم ہوگئی۔ میں نے کہا یہ مغالطہ آفرینی ملاحظہ فرمائیں، کوئی آگے نہیں بڑھتا۔ علامہ اقبالؒ کی وفات کے چھے مہینے بعد انہی مولانا حسین احمد مدنی نے ایک مخصوص پمفلٹ لکھا تھا جس میں یہ کہا تھا کہ اقبالؒ بالکل غلط ہے جو میں نے کہا تھا وہ بالکل صحیح ہے۔ اقبالؒ تو نہیں تھا لیکن اس کے شاگرد موجود تھے۔ میں نے اس کا جواب لکھا پھر۔ آج تک اس کا جواب کسی کے ہاں سے نہیں آیا۔ بات میں یہ کر رہا تھا کہ یہ عجمی اسلام تھا جس کے متعلق یہ کہتے تھے اقبالؒ بھی قائداعظمؒ بھی۔ ملت کو ان کے چنگل سے چھڑانا چاہتے تھے تھیوکریسی سے، جس سے یہ آزادی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اور وہ وہ اسلام لا رہے تھے جس میں وہی عقائد نماز روزہ حج زکوٰۃ نکاح طلاق کے مسائل۔ اس کی آزادی کا نام وہ اسلام کی آزادی کہتے تھے۔ تو آپ نے سمجھ لیا کہ مذہب اور دین میں فرق کیا تھا۔

اگلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہندوؤں کی طرف سے اس کی مخالفت ہوئی۔ ایک منٹ میں جھٹک دیا جاسکتا ہے کہ ٹھیک ہے وہ سیاسی مخالفت تھی، وہ کیوں نہ کرتے۔ وہ چاہتے ہی نہیں تھے کہ مسلمان اپنی ایک الگ مملکت قائم کرلیں۔ بات یہ نہیں

تھی۔ میں نے عرض کیا ہے کہ یہ بات بڑی گہرائی میں جا کر سمجھنے کی ہے کہ ہندو کیوں مخالفت کر رہا تھا۔ قائداعظمؒ نے جب یہ کہا کہ یہ مملکت Religion کی بنیادوں کے اوپر قائم ہوگی اور یہ انڈیا میں نہیں ہوسکتی اس کے لیے الگ خطۂ زمین چاہیے۔ کانگریس پارٹی کا لیڈر عیسائی تھا، اُس نے وہاں یہ جواب دیا تھا کہ اب یہ ناممکن ہے کہ کوئی ایسا نظامِ حکومت قائم کیا جاسکے جس کی بنیاد مذہب پر ہو۔ غور فرمایا آپ نے مخالفت کس بات کی تھی۔ اب وقت آچکا ہے کہ ہم اعتراف کرلیں اور اسے اچھی طرح ذہن نشین کرلیں کہ مذہب اور خدا کو ان کے مناسب مقام یعنی آسمان کی بلندیوں پہ رکھ دیا جائے اور انہیں خوامخواہ زمین کے معاملات میں گھسیٹ کر نہ لایا جائے۔ اس بات کا تو تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ اگر مذہب کو سیاست سے الگ نہ کیا جائے تو کوئی نظامِ حکومت قائم رہ سکتا ہے۔ عصرِ حاضر میں بہترین نظامِ حکومت اس نظریہ پر قائم ہوسکتا ہے کہ جغرافیائی حدود کے اندر گھرا ہوا ایک ملک ہو اور اُس ملک کے اندر رہنے والے تمام افراد معاشی اور سیاسی مفاد کے رشتے میں منسلک ہو کر ایک قوم بن جائیں، ایک حکومت قائم کرلیں۔ یعنی یہ کہ اب وہ دَور نہیں رہا کہ مذہب کی بنیادوں کے اوپر حکومت قائم کی جاسکتی ہے۔ ہندوستان ٹائمز میں اسی Speech پر حاشیہ آرائی کرتے ہوئے لکھا تھا کہ حکومتِ الٰہیہ کا تصور ایک داستانِ پارینہ ہے اور مسلمانوں کا فعل عبث ہوگا اگر وہ ہندوستان جیسے ملک میں اس کے احیاء کی کوشش کریں۔ یہاں مختلف جماعتیں ایک دوسرے سے گتھی ہوئی ہیں یا اس امر کا خیال کرے کہ اس مقصد کے لیے ملک کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ یہ علامت خوش آئند ہے کہ خود مسلمانوں کے ذمہ دار رہنما اس سراب کے پیچھے لگنا نہیں چاہتے۔

میاں عبدالخالق معمارِ پاکستان:

سوال: پرویز صاحب! تحریک پاکستان کے دوران آپ گورنمنٹ سروس میں تھے اور یہ تحریک سیاسی تھی پھر آپ اس میں کیسے آ گئے کہ وہاں ملازمت کی پابندیاں تھیں؟

پرویز صاحب:

میاں صاحب! جیسا کہ میں اکثر کہا کرتا ہوں میں 1930ء کا پاکستانی ہوں جب علامہ اقبالؒ نے الہ آباد کے مقام پر اپنے خطبۂ صدارت میں اس کا تصور دیا تھا اُس وقت تو عام طور پر ملک میں اسے ایک شاعر کا تخیل سمجھا گیا تھا۔ لیکن میں تو چونکہ اس کی لِم سے واقف ہو چکا ہوا تھا، میرے نزدیک یہ میرے دین کا جزو، میرے ایمان کا حصہ بن چکی ہوئی تھی۔ لیکن تحریک کوئی نہیں تھی اُس وقت، محض نجی طور پر نظری طور پر آپس میں کچھ گفتگو ہوا کرتی تھی، کچھ بحث مباحثہ ہوتا تھا لیکن چرچا اس کا کچھ عام نہیں تھا۔ 1930ء سے میں سمجھتا ہوں 1935ء تک میری پوزیشن بھی ملک کے اندر محض ایک گورنمنٹ سرونٹ کی نہیں رہی تھی بلکہ مختلف حلقوں میں بڑی نمایاں پوزیشن حاصل کر لی تھی میں نے۔ علمی، ادبی اور اُس زمانے کی اصطلاح کے مطابق مذہبی Circles کے اندر خاصی ممتاز شخصیت سمجھا جاتا تھا۔ میں کسی تحریک کا حصہ نہیں تھا لیکن مختلف تحریکوں کے جو نامور لیڈرز تھے، شخصیتیں تھیں ان سب کے ساتھ میرے مراسم اور تعلقات تھے۔ ٹھیٹھ کانگریس کے اندر مولانا ابوالکلام جیسے

آدمی، مفتی کفایت اللہ جیسے، مولانا احمد سعید جیسی شخصیتیں، دیوبند کے علماء میں سے مولانا انور شاہ صاحب، مولانا شبیر احمد عثمانی جیسی شخصیتیں، آغاز میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مظہر علی اظہر وہ میرے ہم وطن بھی تھے۔ یہ دارالمصنفین کے سید سلیمان ندوی، ان کا پورا حلقہ، ادھر ادبی طور پہ نیاز فتح پوری جیسے بھی۔ اگرچہ مذہبی حلقہ جب آتا تھا تو اس میں ان کے ساتھ خادم بھی رہتا تھا۔ سیکریٹریٹ کی اسٹیبلشمنٹ کا عہدہ بھی میرے پاس تھا وہ اس لیے کہ سیکریٹریٹ کے مسلمانوں کا مرکز بھی میں تھا۔ وہاں نئی دلی میں ایک گاؤں کی مسجد تھی اُس کا نام رائے چھینہ تھا۔ تو وہ مسجد باقی رہ گئی تھی عین پارلیمنٹ ہاؤس کے سامنے، سیکریٹریٹ کے بلاک کے درمیان۔ تو اس میں جمعہ کا خطبہ میں دیا کرتا تھا۔ اس کی وجہ سے سیکریٹریٹ کے مسلمان تو ایک طرف، پارلیمنٹ میں جتنے یہ مسلمان ممبرز بھی تھے، وہ بھی وہیں جمعہ ادا کرتے تھے۔ شہرت ایسی تھی میرے ان خطبوں کی کہ شہر کے بڑے بڑے لوگ بھی وہاں آیا کرتے تھے۔ تو یہ حیثیت اس تمام دوران میں بغیر کسی تحریک یا گروہ یا مذہب یا فرقے کے ساتھ وابستہ ہوئے بغیر، یہ پوزیشن مجھے حاصل ہوگئی ہوئی تھی۔ تحریک کوئی نہیں تھی، سیاست میں جسے کہتے ہیں آ ہی نہیں سکتا تھا، نہ میں آیا تھا۔ نہ یہ جتنی تحریکیں تھیں ان کے ساتھ سیاسی طور پہ مجھے کوئی دل بستگی ہوسکتی تھی۔ کیونکہ یہ تو تصور ہی الگ تھا اور ان میں سے کوئی بھی اسے اپنا نہیں رہا تھا۔

1937ء کے اواخر کا ذکر ہے کہ قائداعظمؒ نے مجھے ایک دن بلایا اور مجھے کہا کہ مجھے یہ معلوم ہے کہ پاکستان کی تحریک یا مطالبہ جو ہے تمہارے لیے جزوِ ایمان بن گیا ہوا ہے۔ اس تحریک میں ہندو اور انگریز کا مقابلہ تو ہم کرلیں گے۔ لیکن یہ حضرات جو قال اللہ اور قال الرسول کا لباس اوڑھ کے اس کی مخالفت میں آئے ہیں، میں چاہتا یہ ہوں کہ اس محاذ کو تم سنبھال لو۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ حضرتِ علامہ اقبالؒ کے ایماء پر یہ چیز انہوں نے کہی تھی۔ دل کی آواز تھی، ایمان کا تقاضا تھا کہ میں اس پہ لبیک کہوں۔ دفتر کی ملازمت جو تھی، ذہن میں یہ تھا کہ وہ کہیں آڑے نہ آجائے۔ تو میں نے اُسی وقت فیصلہ کرلیا کہ کوشش کروں گا کہ اس کو نبھاؤں۔ لیکن اگر کسی وقت دونوں میں تفاوت پیدا ہوگیا تو بہرحال ملازمت چھوڑ دوں گا، اِسے تو چھوڑ نہیں سکتا۔ تو میں نے اس کے لیے جنوری 1938ء میں انٹر کالجیٹ مسلم برادرہُڈ کے اہتمام سے یومِ اقبالؒ یہاں منایا گیا تھا لاہور میں، بڑے شان کا وہ یوم اقبالؒ حضرت علامہؒ کی زندگی میں، اگرچہ وہ اُس زمانے میں بسترِ مرگ پر تھے قریباً۔ دلی سے ہمارا قافلہ مولانا اسلم جیراجپوریؒ کے زیرِ قیادت، میں تھا اور میری زندگی بھر کے رفیق شیخ سراج الحق مرحوم (موت نے انہیں پچھلے سال مجھ سے چھین لیا)، اسد ملتانی مشہور شاعر، ایک اور دوست وہاں سے آئے تھے۔ میرے کمرے میں آپ دیکھیں گے ایک ہی گروپ فوٹو ہے وہ سامنے اور وہ اُسی یومِ اقبالؒ کی فوٹو ہے۔ یہ جسٹس جاوید اقبال مولانا اسلم جیراجپوریؒ کے سامنے زمین پہ بیٹھے ہیں، بچے تھے تیرہ چودہ سال کی عمر تھی ابھی۔ تو یہ ڈسکس ہوا یہاں حضرت علامہؒ کے ساتھ بھی، تو وہاں بھی یہی چیز ہوئی کہ سب سے پہلی چیز تو یہ ہے کہ اس کے لیے ایک Organ، ایک آلۂ ابلاغ، ایک ماہنامہ، کم از کم اس کا اجراء ہو۔ طلوعِ اسلام اس سے پہلے سید نذیر نیازی مرحوم نے نکالا تھا، وہ پانچ چھے پرچے صرف نکلے تھے تو وہ اُس زمانے میں التوا

میں پڑ گیا تھا۔ تو طے یہ ہوا کہ اُسی نام سے وہی پرچہ اس کا اجرا دلی سے کیا جائے اور وہ اس محاذ کو سنبھال لے تو چنانچہ یہاں آنے کے بعد یہ چیز جو تھی میں نے طے کی۔ سوال یہ تھا ملازمت کا۔ میں ساری عمر ہمیشہ قانون کا پابند رہا ہوں۔ میں نے زندگی میں کسی قانون کی خلاف ورزی آج تک نہیں کی اور قوانین بھی دہرے تھے اُس زمانے میں ایک تو ملک کے قوانین تعزیرات دوسرے گورنمنٹ سرونٹ Conduct Rules۔ یہی جو Govt. Servant Conduct Rules جو تھے، یہ ہیڈنگ بھی میرے پاس تھا Establishment کی وجہ سے۔ میں جانتا تھا کہ اس میں کیا کیا ایسے Loop Holes ہیں جن سے کچھ فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ اس میں اس سے پیشتر کہیں کہیں ترامیم بھی میری ہی کی ہوئی تھیں۔ تو پہلی چیز تو اس میں یہ تھی کہ قائداعظمؒ کے ساتھ میرے تعلقات، یہ پوشیدہ نہیں رہ سکتے تھے، اس کے لیے تو میں نے اجازت لے لی اُن کو دیا لکھ کے اور ان کو کہا کہ یہ سیاست کے اعتبار سے میرے ان کے ساتھ مراسم نہیں ہونگے، دین کی نسبت سے میرے مراسم ان کے ساتھ ہوں گے اور یہ ساری دلچسپیاں قرآن کی بناء پر ہونگی۔ تو میں نے عرض کیا کہ میری صرف ایک یہ پوزیشن بھی تھی اور انہیں معلوم تھا۔ میں آگے چل کے بتاؤں گا کہ انگریز کو کیا کچھ معلوم تھا۔ تو عجیب بات ہے کہ اس پہ انہوں نے بخوشی مجھے اجازت دے دی اور انہوں نے کہا کہ تمہیں اس کی بھی ضرورت نہیں ہے کہ تم ہر بار رپورٹ کیا کرو کہ تم مل کے آئے ہو تمہیں عام کھلی ہوئی اجازت ہے، تم جا سکتے ہو۔ تو پھر یہ میں نے یوں طے کر لیا۔

جہاں تک طلوعِ اسلام کا تعلق ہے Govt. Servant Conduct Rules کے تابع کوئی ملازم سرکار کسی قسم کے کسی ماہنامے یا اخبار کا نہ ایڈیٹر ہو سکتا تھا، منیجر کی حیثیت سے بھی نہیں اور پبلشر کی حیثیت سے نہیں، یہ نہیں ہو سکتا تھا۔ طلوع اسلام جو جاری کیا تو اس میں ان تینوں حیثیتوں میں میرا نام کہیں نہیں لکھا۔ جہاں تک مضامین کا تعلق ہے اس کی گنجائش پہلے سے وہاں موجود تھی Govt. Servant Conduct Rules میں کہ عام مذہبی مضامین تو اپنے نام سے دیے جا سکتے ہیں۔ لیکن اگر اس کے علاوہ کسی اور Topic کے اوپر بھی لکھنا ہو تو قلمی نام سے لکھا جا سکتا ہے اور یہ قانون کی خلاف ورزی نہیں ہوگی۔ اُس زمانے کے طلوعِ اسلام کے فائل آپ کے سامنے ہیں اُن میں آپ دیکھیں گے کہ یہ پرویز بھی چودھری غلام احمد پرویز ہوتا تھا تو یہ چودھری صاحب کے نام سے تو کوئی اِکا دُکا مضمون ہوتا تھا اور اس کے بعد پھر وہی قلمی نام تھے اور مختلف قلمیں تھیں ہر قلم کا الگ ایک نام ہوتا تھا۔ یہ کچھ آیا کرتا تھا اور بعض اُس میں اکثر و بیشتر بغیر کسی نام کے ہوتے تھے کہ وہ ادارے کی طرف سے وہ مضمون ہے۔ اب آپ دیکھیے طلوعِ اسلام اور آپ تو دیکھتے چلے آ رہے تھے اُس زمانے میں آگ برساتا تھا صاحب یہ۔ یہ کیفیت تھی۔ انگریز، ہندو، کانگریسی، احراری، جتنے مخالف تھے تحریک پاکستان کے اُن سب کے ساتھ ٹکراؤ ہوتا تھا۔ اکیلا ایک شخص۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس پرچے نے اُس زمانے میں دھوم مچا دی تھی۔ یہ سارا کچھ ہو رہا تھا عجیب بات ہے آپ جانتے ہیں انگریز کے خلاف میرے دل میں کتنے دشمنی کے، مخالفت کے جذبات ہیں، جو کچھ اس نے مسلمانوں کے ساتھ کیا۔ لیکن وہ جو کہتے ہیں Give the devil his due مجھے یہ کہنا پڑے گا اور میں سمجھتا ہوں اگر میں یہ نہ کہوں تو بد

دیانتی ہوگی کہ میں نے انگریز کو کم از کم جس سے میں متعلق تھا، اُس میں قانون کا بڑا پابند پایا، قانون کا احترام کرتا تھا وہ۔

اُس کے لیے میں صرف ایک واقعہ پیش خدمت کروں گا۔ اس سارے دوران میں صرف ایک دفعہ باز پرس ہوئی میری۔ جوائنٹ سیکرٹری ایک ہمارا ہوتا تھا بڑا دبنگ میں (سرکاری زبان میں) Direct Submit کرتا تھا اُسے، اور Service Matter ہمارے آپس میں مشترک ہوتے تھے۔ انہوں نے مجھے بلایا اور اس نے بُلا کے، خود وہ کام کر رہا تھا۔ بہت بڑا ٹیبل تھا ایک شیٹ کے اندر ایک پورا نوٹ لکھا ہوا، میری طرف پھینک دیا۔ میں نے دیکھا تو وہ ڈائریکٹر انٹیلی جنس کا نوٹ تھا۔ آپ غور فرمایئے اُس زمانے کا ڈائریکٹر انٹیلی جنس بیورو، میں ان کے ساتھ ہی متمسک ہوتا تھا۔ بڑی شخصیت تھی، بڑی اہمیت تھی۔ اور یہ پولیٹیکل تحریکیں بہت زور پہ تھیں۔ اُس نوٹ میں اس نے لکھا ہوا تھا کہ میں پوچھنا یہ چاہتا ہوں ہوم ڈیپارٹمنٹ سے کہ انگریزوں کی نیت کیا ہندوستان سے چلے جانے کی ہے، مجھے تو کچھ ایسا ہی نظر آتا ہے۔ اس لیے کہ ہوم ڈیپارٹمنٹ کے اندر ایک شخص بیٹھا ہوا ہے اور یہ ہے وہ پرچہ طلوع اسلام جس میں اس قسم کے یہ مضامین نکل رہے ہیں۔ تو کوئی ایکشن نہیں لیا جا رہا۔ کیا یہ تساہل ہے یا دانستہ یہ کچھ ہو رہا ہے۔ وہ بڑا ہی متجبر قسم کا مخالف نوٹ تھا۔ میں اُس کو پڑھتا گیا۔ اُس نے اپنا کام جو تھا، اُس کو ایک طرف رکھا اور اس کے بعد کہا کہ ہاں کہیے کیا کہتے ہیں آپ؟ میں نے کہا جی پہلے میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ مجھے یہاں آپ نے ایک ہندوستانی شہری کی حیثیت سے طلب فرمایا ہے یا ایک گورنمنٹ سرونٹ کی حیثیت سے۔ کہنے لگا Citizen of India کی حیثیت سے، تو میں بلا ہی نہیں سکتا آپ کو، گورنمنٹ سرونٹ کی حیثیت سے آئے ہو۔ میں نے کہا بات طے ہوگئی۔ گورنمنٹ سرونٹ کی حیثیت سے تو میں نے کہا آپ کو اور مجھے معلوم ہے کہ .Govt Servant Conduct Rules ہیں جن کے تابع میں آتا ہوں، تعزیراتِ ہند کے تابع نہیں آتا۔ کہنے لگے ٹھیک بات ہے۔ وہاں کاپی رکھی تھی اس کی میز پہ۔ میں نے کہا یہ میرے اور آپ کا Subject ہے، روز ہم ڈیل کرتے ہیں اس کو یہ ساتھ رکھی ہوئی ہے کاپی۔ یہ بتایئے اس میں سے کس قانون کی خلاف ورزی میں نے کی ہے۔ طلوعِ اسلام کا پرچہ بھی اس نے ساتھ رکھ لیا ہوا ہے۔ آپ دیکھ لیجیے کہ اس میں کہیں ایڈیٹر کی حیثیت سے، منیجر کی حیثیت سے یا میرے نام سے کوئی مضمون ایسا جو آپ کے نزدیک قابل گرفت ہو۔ تو جب یہ چیز ہے ہی نہیں اس کے اندر تو فرمایئے میرے خلاف الزام کیا ہے، مواخذہ کس بات کا ہے۔ وہ ڈی آئی جی انگریز بہادر کا جس نے یہ نوٹ لکھ کے بھیجا ہے اور انٹرنل پالیٹکس Home میں ہی ڈیل ہوا کرتے تھے، اُس کا یہ انچارج ہے۔ اُس نے اُس کو رکھ لیا اور اس نے ٹیلیفون اٹھایا میرے سامنے اُسی وقت اور اسے کہا اور وہ جسے کہتے ہیں پڑ گیا اُسے کہنے لگا تم سے تو حماقت ہوئی ہی تھی تم سے زیادہ مجھ سے حماقت ہوئی کہ میں نے وہ نوٹ تمہارا دیکھ کر بغیر سوچے سمجھے اُس کو بلا بھیجا۔ اب وہ یہ مجھے Explanation دے رہا ہے، میرے پاس تو اس کا جواب کوئی نہیں ہے۔ تمہارے پاس اگر کوئی جواب ہے تو بتاؤ۔ تو پتہ نہیں اُس نے کیا کہا ٹیلیفون اس نے بند کیا اور وہ جوان کا انداز ہوتا ہے افسوس ہے I am sorry معذرت طلب کی کہ آپ کو تکلیف دی، آپ کے خلاف کوئی چارج نہیں ہے۔ اُس نے یونہی زیادتی سے

یہ نوٹ لکھ بھیجا تھا' کوئی بات نہیں آپ جایئے، میں نے کہا، شکریہ آپ کا۔ تو میں اٹھ کے چلا آیا تو وہ اُدھر سے اپنی میز سے چکر لگاتا ہوا آیا اتنے میں میں دروازے تک پہنچ چکا تھا۔ بڑا دبنگ تھا لمبے قد کا وہ افسر تھا میں ذرا چھوٹے قد کا تھا اور اس نے یہ کہا کہ یہ بات تو سرکاری جو تھی، وہ ہوگئی لیکن Here is a fatherly advice' میں نے کہا ارشاد' کہنے لگے کہ یہ پولیس کا افسر ہے اس کی آج Ego کو بڑی سخت انجری پہنچی ہے۔ تم سمجھ سکتے ہو کیا ہوا ہے اس کے ساتھ۔ میں نے کہا ٹھیک ہے۔ کہنے لگے یہ جو ہیں یہ بڑے انتقامی ہوتے ہیں، محتاط تو تم پہلے بھی بہت ہو لیکن اس کے بعد زیادہ محتاط رہنا۔ میں نے کہا جی آپ کا شکریہ، آپ نے مجھے کہا Fatherly Advice۔ اگر یہ کسی طرح سے قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بھی جھگڑ پڑا تو As a father آپ میری پروٹیکشن کریں گے؟ کہنے لگا Of course کبھی کوئی ایسی بات ہو تو فوراً میرے پاس آجاؤ اور آج شام کو تو کلب میں اُس کے ساتھ کرونگا، وہ وہاں بات ہوگی۔

اور اس کے بعد کبھی کسی نے اتنا مواخذہ بھی نہیں کیا، اتنی باز پرس بھی نہیں کی، پورا وقت جو تھا سارے کا سارا وہاں جو گزارا۔ اور یہ بھی نہیں کہ یہ معلوم نہیں تھا یعنی ایک اور واقعہ وہ دلچسپ ہے سنانے کے قابل بھی ہے کہ خود اپنے جو تھے اُس زمانے میں یعنی اب تو میں آ گیا ناں اُس تحریک کے اندر۔ میرے مقام پہ یہ مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے یا پارلیمنٹ کے ممبرز کے اجلاس شام کو وہیں اکٹھے ہوتے تھے میرے ہاں۔ یہ جتنے یہاں Question کرنے ہوتے تھے وہاں تیار ہوتے تھے، ان کے جوابات قبل از وقت وہاں ڈسکس ہوا کرتے تھے۔ وہ میرا مکان گورنمنٹ کا کوارٹر تھا وہ سارا مرکز ہوتا تھا ان تمام Discussions کا، ان بحثوں کا۔ اور میں نے پہلے یہ کہا ہے کہ وہ میرے خطبے ہوتے تھے اُس مسجد میں مختلف تقاریب کے اوپر میری تقاریر ہوتی تھیں اور یہ سارا کچھ جو طلوعِ اسلام یہ کچھ بھی تھا۔ ایک دفعہ یہ جامعہ ملیہ اسلامیہ ڈاکٹر ذاکر حسین کا جو قائم کردہ تھا یہ بڑے پکے قسم کے کانگریسی تھے لیکن ڈاکٹر ذاکر حسین بڑا وسیع الظرف انسان تھا سب کے ساتھ اس نے تعلقات رکھے ہوئے تھے۔ کوئی فنکشن تھا جامعہ میں، جامعہ نذرا وتھلہ جسے کہتے ہیں ناں جمنا کے کنارے وہاں چلا گیا ہوا تھا تو اس میں ہر تحریک کے ہر مکاتبِ فکر کے اور ہر ذہنیت کے ہر طبقہ کے جو بڑے بڑے مشاہیر تھے، ان کو بلا بھیجا تھا۔ ہوم ڈیپارٹمنٹ کے سیکرٹری اور وہاں کے ممبر کہلاتے تھے اُس زمانے میں منسٹر نہیں کہلاتے تھے، یہ لوگ بھی وہاں موجود تھے۔ اتنا بڑا ایک اجتماع تھا مجھے بھی بلایا تھا۔ میں حسبِ معمول ایک کلرک کی حیثیت سے گیا وہاں۔ دائرے میں یہ سب بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ سامنے دائرے کے کنارے مولانا شوکت علی مرحوم، وہ تشریف فرما تھے۔ میں نے اپنی سائیکل ایک طرف رکھی اور ایک طرف ایک کنارے پہ اپنی حیثیت کے مطابق اپنے ذہن میں، وہاں بیٹھنا چاہا۔ وہیں انہوں نے آواز دی حضرت صاحب! حضرت صاحب وہاں نہ بیٹھیے گا، ادھر آیئے گا، ادھر آیئے گا۔ میں نے کہا لو بھئی میں نے چھپ کے یہاں چپکے سے بیٹھنا چاہا تھا، مولانا شوکت علی چھے سات فٹ کے قد و قامت کے وہ بزرگ اتنی بڑی آواز میں نے اس کو بھی طرح دیا تو وہ وہاں سے چل کے یہاں انہوں نے آنا شروع کر دیا۔ میں نے کہا اب تو یہ بے ادبی سی ہے کہ میں بیٹھا رہوں میں بھی اٹھ کے

چار قدم گیا، عین اس دائرے کے درمیان آ کے تو انہوں نے میرے مونڈھے پہ ہاتھ رکھا اور وہ ان سب کو مخاطب کر کے کہنے لگے یہ جو میرا آفیشل طبقہ تھا، وہ ان کے سارے یہ بیٹھے ہوئے تھے کہنے لگے کہ یہ ہم لوگ تو جانتے ہیں، آپ لوگ شاید نہیں جانتے علامہ صاحب کو۔ کہنے لگے کہ میں اتنا ہی کہنا چاہتا ہوں کہ میرے بھائی نے ایک تقریر کی، دو سال کی قید کاٹی ہے انہوں نے۔ یہ ہر جمعہ کے خطبے میں اُس سے زیادہ آگ برسانے والی باتیں کرتے ہیں، اس لیے ہمارے نزدیک تو ہم سب میں زیادہ حریت نواز واقع ہوئے ہیں، آیئے میرے ساتھ بیٹھیے۔ میں نے کہا لیجیے صاحب۔ یعنی میں یہ عرض کر رہا تھا کہ یہ بات نہیں تھی کہ ڈھکی چھپی تھی۔ اپنے سرکل کے اندر یہ چیزیں موجود تھیں یہ ساری۔ لیکن اس سارے دوران میں میاں صاحب! ایک دفعہ بھی پھر باز پرس نہیں ہوئی ہے۔ میں شاید پھر عرض کروں کہ باز پرس ہوئی تو سب سے پہلے پاکستان میں آنے کے بعد ہوئی۔ وہ قصہ پھر بیان کروں گا۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ وہاں تو یہ باز پرس صرف ایک ہی دفعہ ہوئی انگریز کے زمانے میں اور وہ جتنا میں نے عرض کیا، اس کے بعد تو دوبارہ کسی نے مجھ سے پوچھا تک بھی نہیں۔ لیکن یہ باز پرس جو نہایت باز پرس کی نوبت پاکستان میں آ کے یہ قصہ ہوا لیکن یہ تو اس مطلع کا مصرعۂ ثانی ہے وہ بعد میں عرض کروں گا کہ کیا ہوا تھا۔

طریقِ کار ہمارا یہ تھا، میں اور شیخ صاحب مرحوم بہت اچھا گاتے تھے گلا بڑا خوبصورت پایا تھا۔ دفتر سے اٹھنے کے بعد دیکھ لیتے کہ وہ کونسی جگہ ہے جہاں تک پہنچ کے رات کو ایڈریس کر کے وہاں سے واپس آ کے صبح دس بجے پھر اپنے دفتر میں پہنچ جائیں گے۔ اس انتظام کے ماتحت ہم وہ کرتے تھے جہاں کہیں مسلم لیگ کا جلسہ ہوتا تھا۔ قائداعظمؒ اور ان حضرات کے ساتھ یہ انڈرسٹینڈنگ تھی ہماری' اعلان ہوا کرتا تھا کہ اسی پنڈال میں، مسلم لیگ کے اجلاس کے بعد یہاں یومِ اقبالؒ منایا جائے گا اور دلی سے تشریف لا رہے ہیں، وہ نام ہمارا لیا جاتا تھا۔ وہاں ہم پہنچ جاتے تھے اس کے بعد اور وہ قائداعظمؒ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ہم جو کچھ سیاسی زبان میں کہتے ہیں اُس سے زیادہ مؤثر تریں زبان میں یہ اقبالؒ کے الفاظ میں یہ شخص کہہ جاتا ہے اس لیے یہ ہمارا تتمہ یا ضمیمہ بڑا ضروری ہو گیا ہے۔ وہاں یہ شیخ صاحب اقبالؒ پڑھتے، ہم اقبالؒ کی زبان میں جو کچھ انہوں نے سیاست کی زبان میں کہا تھا، دین کی زبان میں، قرآن کے حوالے سے یہ کچھ کہتے۔ یہ کچھ کرنے کے بعد پھر بھاگم بھاگ وہاں سے چلتے اور پھر صبح کو دفتر میں آ کے بیٹھ جاتے۔ یہ سارا قصہ تھا جو ہم کرتے رہے ہیں۔ بڑا رقص تھا بگولے کا، ایک جوش تھا ایک جنون تھا، پتہ نہیں کیا تھا۔

یہ ہیں علامہ غلام احمد پرویزؒ مرحوم کی کتابِ زندگی کے چند منور صفحات۔ ان سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ 1982ء کا وہ انٹرویو جو سوال و جواب کی صورت میں تھا، اس کی دیگر تفصیلات کی صورت کیا ہوگی۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

غلام احمد پرویزؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گذشتہ سے پیوستہ

شرابِ کہن

ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ

چھ خطبات

چوتھا خطبہ:

افراد اور اُمت

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (3:109)

ترجمہ: تم بہترین قوم ہو جسے تمام نوعِ انسانی کی بھلائی کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔

سابقہ خطبہ میں یہ حقیقت آپ کے سامنے آ چکی تھی کہ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کے مطابق ہر کام ___ خواہ وہ دل میں گزرنے والا ارادہ ہی کیوں نہ ہو ___ اپنا نتیجہ پیدا کر کے رہتا ہے۔ اس میں وقت تو ضرور لگتا ہے، جس طرح ایک بیج کو فصل بننے کے لئے وقت لگتا ہے۔ لیکن یہ کبھی نہیں ہوتا کہ بیج بو یا جائے اور اس سے درخت بن کر پھل پیدا نہ ہو۔ یا بیج تو ہو کیکر کا لیکن اُس پیڑ میں آم لگ جائیں۔

لیکن یہ دیکھنے کی بات ہے کہ بیج، درخت کس طرح بنتا ہے ___ بیج کو مٹی میں ملایا جاتا ہے۔ پھر اس میں پانی دیا جاتا ہے۔ اوپر سے سورج کی گرمی پہنچتی ہے۔ اس سے اُس بیج میں سے کونپل نکلتی ہے۔ وہ ہوا سے غذا حاصل کرتی ہے اور آگے بڑھنا شروع ہو جاتی ہے۔ لہٰذا، بیج کے درخت بننے کے لئے اس کے ساتھ مٹی، پانی، حرارت، روشنی، ہوا کا ہونا ضروری ہے۔

لیکن اگر ایسا کریں کہ اعلیٰ قسم کا بیج لیں اور اُسے برآمدے کے ایک کونے میں رکھ دیں۔ اس کے پاس ہی ایک طرف صاف ستھری مٹی کا ڈھیر لگا دیں۔ ایک طرف پانی کی بالٹی بھر کر رکھ دیں۔ سورج کی دھوپ سے روشنی اور حرارت اس بیج کو خود بخود ملتی جائے گی۔ ہوا بھی برآمدے میں موجود ہے۔ اس طرح وہ تمام چیزیں جمع ہو جائیں گی جن سے درخت بنتا ہے۔ لیکن آپ سوچئے کہ اگر یہ چیزیں سو برس تک بھی اس طرح پڑی رہیں تو ان سے درخت تو ایک طرف، ایک پتی بھی بن سکے گی؟ کبھی نہیں۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ جب تک یہ تمام چیزیں ایک دوسرے کے ساتھ نہ ملیں، بیج میں سے کونپل کبھی نہیں پھوٹ سکتی۔ بیج سے درخت بننے اور درخت میں پھل آنے کے لئے ضروری ہے کہ یہ سب چیزیں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں اور تعاون بھی اس قسم کا کہ یہ سب اپنی اپنی الگ ہستی کو ایک دوسرے کے اندر جذب کر کے ایک نئی شکل اختیار کر لیں۔

آم، کہ جس کی رنگت خوشبو اور ذائقہ اس قدر دلفریب اور روح افزا ہوتا ہے، مٹی، پانی، حرارت، روشنی اور ہوا ہی کے مجموعہ کا نام ہوتا ہے۔ وہ انہی اجزاء سے بنتا ہے۔ لیکن آپ دیکھئے کہ نہ تو اس کے اندر کہیں یہ چیزیں اپنی اپنی شکل میں الگ الگ موجود ہوتی ہیں اور نہ ہی ان میں سے کسی شے میں آم کی رنگت، خوشبو اور شیرینی ہوتی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ فطرت کا قانون یہ ہے کہ جب تک مختلف چیزیں باہمی تعاون نہ کریں اور ایک دوسرے کے اندر جذب نہ ہو جائیں۔ کوئی نئی چیز پیدا نہیں ہوتی۔ اور جب یہ ایک دوسرے کے اندر جذب ہو جائیں تو اس طرح جو نئی چیز بنتی ہے وہ ان تمام چیزوں سے نہایت ارفع اور اعلیٰ ہوتی ہے جن سے مل کر یہ نئی چیز بنتی ہے۔ آپ غور کیجئے کہ اس مٹی اور پانی کی قیمت اور حیثیت کیا تھی جن کے مل جانے سے آم بنا ہے۔ لیکن آم بن کر ان کی قیمت اور حیثیت کیا سے کیا ہو گئی۔

جس طرح پانی، مٹی، ہوا، حرارت کے الگ الگ رہنے سے کوئی نتیجہ مرتب نہیں ہوتا اسی طرح اگر کسی جگہ کے انسان بھی الگ الگ رہیں تو ان سے کوئی فائدہ بخش کام سرانجام نہیں پاتا۔ لیکن جب یہی افراد ایک دوسرے کے ساتھ مل جائیں تو یہ دُنیا میں ایسے ایسے کام کرتے ہیں جنہیں دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ جب افراد آپس میں مل جائیں تو ان سے قوم بن جاتی ہے۔ قرآن کریم میں اس کے لئے اُمت کا لفظ آیا ہے۔

ہم نے دیکھا ہے کہ جب بیج، مٹی، پانی وغیرہ الگ الگ رہیں، خواہ وہ ایک ہی برآمدے کے اندر کیوں نہ ہوں، ان سے پودا نہیں بنتا۔ پودا بننے کے لئے شرط یہ ہے کہ یہ چیزیں ایک دوسرے سے تعاون کریں بلکہ ایک دوسرے کے اندر جذب ہو جائیں۔ عربی زبان میں اس طرح گھل مل جانے کو اُلفت کہتے ہیں۔ اس طرح، اگر کسی ملک کے افراد ایک دوسرے سے الگ الگ رہیں اور ہر ایک اپنے اپنے فائدے کے پیچھے لگا رہے، تو انہیں قوم یا اُمت نہیں کہا جا سکتا۔ یہ اُس وقت اُمت بنتے ہیں جب یہ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں اور گھل مل کر رہیں۔ یعنی ان میں اُلفت پیدا ہو جائے۔ چنانچہ قرآن مجید میں مسلمانوں کے متعلق ہے کہ: وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ (3:103)۔ ''تم اللہ کے اس انعام کو یاد کرو کہ (ایک وقت وہ تھا) جب تم الگ الگ تھے اور ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ پھر اس نے تمہارے دلوں میں اُلفت ڈال دی۔ اور تم ایک دوسرے کے ساتھ گھل مل کر رہنے لگے۔ اس طرح تم اس کی نعمت سے بھائی بھائی بن گئے۔ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ۭ (3:103) تم تباہی اور بربادی کے جہنم کے کنارے تک پہنچ چکے تھے کہ اللہ نے تمہیں اس میں گرنے سے بچا لیا۔ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ (3:103) اس طرح اللہ اپنے قوانین کو تمہارے فائدے کے لئے کھول کھول کر بیان کرتا ہے تا کہ زندگی اور کامیابی کا سیدھا راستہ تمہارے سامنے آ جائے۔ دوسری جگہ ہے: وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا (2:143) ''اور اس طرح ہم نے تمہیں ایک بہترین اُمّت (قوم) بنا دیا۔'' اس سے آپ نے دیکھ لیا ہو گا کہ قرآن مجید کی رُو سے افراد اس وقت قوم بنتے ہیں جب ان کے دل ایک دوسرے میں گھل مل جائیں۔ جب ان کے مفاد ایک دوسرے کے مفاد میں جذب ہو جائیں۔

اگر ایسی صورت پیدا نہ ہو تو محض ایک مقام پر اکٹھے رہنے سے اُمّت نہیں بن سکتی۔ قرآنِ کریم نے ایسے لوگوں کے لئے کہا ہے کہ: تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَّقُلُوبُهُمْ شَتّٰى (14:59) تو سمجھتا ہے کہ وہ اکٹھے ہیں حالانکہ ان کے دل ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ ''بَأْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيدٌ (14:59) اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کی آپس میں سخت لڑائی ہوتی رہتی ہے۔ ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُونَ (14:59) یہ اس لئے کہ یہ لوگ عقل وفکر سے کام نہیں لیتے۔

آپ نے غور کیا کہ قرآن مجید نے افراد کے قوم بننے کے لئے کیا کیا شرائط عائد کی ہیں۔ یہ کہ ان کے دل ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہوں۔ ان کے مفاد ایک دوسرے کے مفاد میں جذب ہوں۔ ان کا آپس میں کسی قسم کا لڑائی جھگڑا نہ ہو۔ اور وہ جذبات سے مغلوب ہو کر یونہی آپے سے باہر نہ ہو جایا کریں بلکہ ہر معاملہ پر ٹھنڈے دل سے غور وفکر کیا کریں۔ اس طرح جب مختلف افراد ایک قوم بن جاتے ہیں تو تمام افراد کی عزت اور پوزیشن ایک جیسی ہو جاتی ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ پھولوں کے پودوں میں کھاد ڈالی جاتی ہے۔ کھاد ایسی چیز ہے جس سے ہر شخص نفرت کرتا ہے۔ اس سے پرے پرے رہنا چاہتا ہے۔ لیکن وہی کھاد جب اپنے آپ کو مٹی اور پانی میں جذب کر دیتی ہے تو پھول بن جاتی ہے جسے ہر شخص سینے سے لگائے اور سر پر چڑھائے رکھتا ہے۔ کھاد کو اس قدر حسین، خوشبودار، صاحبِ عزت کس چیز نے بنا دیا؟ اس چیز نے کہ اس نے الگ رہنے کے بجائے اپنے آپ کو دوسرے اجزاء کے اندر جذب کر دیا۔ اسی طرف اُمت کے اندر جذب ہو جانے سے ہر فرد کی قدر و قیمت بڑھ جاتی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ مٹھائی چار روپے سیر بکتی ہے۔ مٹھائی میں کیا کیا ہوتا ہے؟ میدہ جس کی قیمت بارہ آنے سیر ہے۔ شکر (یعنی کھانڈ) جس کا نرخ ایک روپیہ فی سیر ہے۔ اگر میدہ الگ رہے اور شکر الگ رہے تو ان کی قیمت بارہ آنے اور ایک روپیہ فی سیر سے ایک پیسہ بھی زیادہ نہ ہو۔ لیکن جب انہوں نے اپنے آپ کو دیگر اجزاء کے ساتھ ملا دیا تو ان کی قیمت بھی چار روپے فی سیر ہوگئی۔[1] اسی طرح جب افراد، اپنے آپ کو اُمت میں جذب کر دیتے ہیں تو سب افراد کی قیمت ایک جیسی ہو جاتی ہے۔ اس میں بڑے اور چھوٹے کا کوئی فرق نہیں رہتا۔ جو قیمت قوم کے سب سے بڑے فرد کی ہوتی ہے وہی قیمت قوم کے سب سے چھوٹے فرد کی ہوتی ہے ان میں تقسیم کار کا فرق ضرور ہوتا ہے۔ کسی کے ذمّے کوئی کام اور کسی کے ذمّے کوئی۔ لیکن تقسیمِ کار سے افراد کی عزت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ عزت سب کی برابر ہوتی ہے۔ آپ گھڑی کو دیکھئے۔ اس میں مختلف پرزے ہوتے ہیں اور ہر ایک پرزے کے ذمّے الگ الگ کام ہوتے ہیں۔ اس میں سو روپے کا ہیرے کا ریزہ بھی ہوتا ہے اور دو پیسے کا پیچ بھی۔ الگ الگ دیکھئے تو ہیرے کے مقابلے میں پیچ کی کوئی اہمیت اور قیمت نہیں ہوتی۔ لیکن گھڑی کے اندر پیچ کی اہمیت اس قدر ہوتی ہے کہ وہ اگر ذرا ڈھیلا ہو جائے اور اپنا کام چھوڑ دے تو ساری گھڑی بیکار ہو جاتی ہے اور بڑے سے بڑے پرزے کی اہمیت بھی کچھ نہیں رہتی۔ جب مختلف افراد باہمی جذب سے اُمت بنتے ہیں تو جو شخص چھوٹے سے چھوٹا کام کرے اس کی اہمیت بھی باقی پرزوں کے برابر ہوتی ہے۔ یہ ہندوؤں کا مذہب ہے جس میں برہمن کی عزت اور اہمیت الگ ہوتی ہے اور کھشتری کی الگ۔

(1) کیسے بھلے دن تھے جب یہ خطبات لکھے گئے تھے۔ (1960ء کے لگ بھگ)

دیش کی الگ ہوتی ہے اور شودر کی الگ۔ اسلام اس قسم کی کوئی تفریق نہیں کرتا۔ وہ تمام افراد کو ایک اُمت قرار دیتا ہے۔ جتنی اس امت کی قدر و منزلت ہوتی ہے اتنی ہر فرد کی قدر و منزلت ہوتی ہے۔ ان افراد کے دلی تعاون سے اُمت کا نظام قائم رہتا ہے۔ اور جیسا کہ پچھلے خطبہ میں بتایا گیا تھا، خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل اِسی نظام کے ذریعے اپنے نتائج سامنے لاتا ہے۔ یہی نظام ہے جو ظالموں کی کلائیاں مروڑ کر عدل اور انصاف کی فضا قائم کرتا ہے۔ ہمارے ہاں اگر ان ظالموں کے حوصلے دراز ہوتے چلے جاتے ہیں تو اس لئے کہ ہم ایک اُمت۔ ایک قوم کی حیثیت سے نہیں رہتے۔ افراد کی حیثیت سے رہتے ہیں۔ یاد رکھئے۔ قرآن مجید نے ہمیں ایک اُمت بنایا ہے۔ افراد کی حیثیت سے زندگی بسر کرنا مسلمان کا شیوہ نہیں۔ مسلمان اس وقت مسلمان بنتا ہے جب وہ اُمت کی مشینری کا پرزہ بن کر رہتا ہے۔ جونہی وہ اس مشینری سے الگ ہوا، اس کا قلادہ اس کی گردن سے اتر گیا۔

آئندہ خطبات میں یہ بتایا جائے گا کہ قرآنِ مجید کی رُو سے مختلف افراد ایک اُمت کس طرح بنتے ہیں۔ اور اس اُمت کا فریضۂ زندگی کیا ہے۔ والسلام

پانچواں خطبہ:

افراد، قوم کس طرح بنتے ہیں

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا ۟ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ (3:200)

ارشادِ خداوندی ہے کہ اے افرادِ جماعتِ مومنین۔ تم خود بھی ثابت قدم رہو۔ اور دوسروں کو ثابت قدم رہنے کی تلقین کرو۔ ایک دوسرے کے ساتھ جُڑے رہو۔ اور (اس طرح سب مل کر) قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو۔ تقویٰ شعار بنو۔ تاکہ تم کامیاب زندگی بسر کرسکو۔

سابقہ خطبہ میں یہ بتایا گیا تھا کہ اسلامی زندگی یہ ہے کہ تمام افراد باہمی مل کر اُمت بن جائیں۔ اسلامی زندگی اُمت یا قوم بن کر رہنے کی زندگی ہے۔ الگ الگ رہنے اور اپنے اپنے مفاد کے پیچھے دوڑنے کی زندگی مسلمان کی زندگی نہیں۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مختلف افراد ایک قوم کس طرح بنتے ہیں۔ الگ الگ مسلمان ایک اُمت کے دھاگے میں کس طرح پروئے جاتے ہیں۔ آج ہم اس اہم حقیقت کو آپ کے سامنے بیان کریں گے۔

آپ نے کبھی فٹ بال کا میچ دیکھا ہے؟ ضرور دیکھا ہوگا۔ اس میں ایک طرف گیارہ کھلاڑی ہوتے ہیں۔ یہ سب کھلاڑی میدان کے آدھے حصے میں بکھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ کوئی پیچھے، کوئی آگے۔ کوئی درمیان میں، کوئی دائیں، کوئی بائیں۔ کوئی سب سے اخیر ایک جگہ اکیلا کھڑا دکھائی دے گا۔ وہ اس طرح بکھرے ہوئے ہوتے ہیں، جیسے ایک کو دوسرے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ اتنے میں سیٹی بجتی ہے اور بال میدان میں آجاتا ہے۔ یہ بکھرے ہوئے کھلاڑی بڑی تیزی سے بھاگنا شروع کردیتے ہیں۔ میدان میں عجیب ہلچل مچ جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا افراتفری کا عالم ہے۔ لیکن اس افراتفری

اور ہلچل میں ایک چیز عجیب دکھائی دیتی ہے اور وہ یہ کہ ان میں سے جس کے قریب بھی بال آجاتا ہے وہ اسے ایک خاص سمت کی طرف لے جانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ کبھی نہیں ہوتا کہ ان میں سے ایک کھلاڑی بال کو مشرق کی طرف لے جائے اور دوسرے کی باری آئے تو وہ اسے مغرب کی طرف لے جائے۔ جس سمت کو یہ سب کھلاڑی بال کو لے جانا چاہتے ہیں، اُسے انگریزی زبان میں گول کہتے ہیں۔ گول کے معنی نصب العین، منزلِ مقصود۔ وہ نقطہ جس پر سب کی نگاہ ہو۔ وہ چیز جسے سب مل کر حاصل کرنا چاہیں۔ کھلاڑی گیارہ ہوتے ہیں لیکن ان سب کے سامنے گول ایک ہی ہوتا ہے۔ جن کھلاڑیوں کے سامنے ایک مشترکہ گول ہو انہیں انگریزی زبان میں ٹیم کہتے ہیں۔

اسی طرح جب کسی جگہ کے رہنے والے انسانوں کے سامنے ایک مشترکہ نصب العین ہو تو انہیں قوم یا اُمت کہا جاتا ہے۔ لہٰذا، افراد اس صورت میں قوم بن سکتے ہیں جب ان سب کے سامنے ایک گول۔ ایک نصب العین یا ایک منزلِ مقصود ہو۔ اگر کسی ملک کے باشندوں کے سامنے ایک نصب العین نہ ہو تو وہ قوم نہیں بن سکتے۔ یا مختلف لوگوں کے سامنے مختلف نصب العین ہوں تو بھی وہ ایک قوم نہیں بن سکتے۔

دنیا کے مختلف ملکوں کے رہنے والے اپنے سامنے مختلف نصب العین رکھتے ہیں اور اس طرح ایک ملک کے باشندے ایک قوم بن جاتے ہیں۔ لیکن مسلمانوں کا نصب العین خود ان کے خدا نے مقرر کر دیا ہے۔ اس نے ان سے کہا ہے کہ: وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۠ (3:103) تم سب مل کر۔ اکٹھے ہو کر۔ اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے تھامے رکھو (یہی تم سب کا نصب العین ہے۔ اس نصب العین کی وحدت سے تم ایک اُمت بنتے ہو۔ اس لئے تم الگ الگ نصب العین سامنے رکھ کر) مختلف گروہ نہ بن جاؤ۔ یہ ''اللہ کی رسی'' جس سے مسلمان ایک اُمت بنتے ہیں اس کی کتاب یعنی قرآن مجید ہے۔ یہی وہ گول ہے جس کی طرف ہر مسلمان کا رُخ ہونا چاہئے۔ یہی وہ منزلِ مقصود ہے جس کی طرف ان سب کا قدم اٹھنا چاہئے اسی وحدتِ نصب العین کا نام توحید ہے۔ کھیل کے میدان میں جن گیارہ کھلاڑیوں کا گول ایک ہوتا ہے انہیں ایک ٹیم کہا جاتا ہے۔ ان کے مقابلہ میں دوسرے کھلاڑیوں کا گول ان سے مختلف ہوتا ہے۔ وہ دوسری ٹیم کہلاتے ہیں۔ آپ نے غور کیا کہ ایک ہی میدان کے کھلاڑی دو گروہ کس طرح بن گئے؟ محض گول کے الگ الگ ہونے سے۔ موجودہ زمانے کی اصطلاح میں قوم کے نصب العین یا گول کو آئیڈیالوجی کہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان، آئیڈیالوجی کی وحدت کی بناء پر اُمت بنتے ہیں۔ ان سب کی آئیڈیالوجی ایک ہوتی ہے۔ جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ہے اسی کا نام توحید ہے۔ اگر ان کی آئیڈیالوجی مختلف ہو جائے تو اسے شرک کہیں گے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان سے کہا ہے کہ: وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا ۭ كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ۝ (32-3:31) اے مسلمانو! دیکھنا تم کہیں (مومن ہونے کے بعد پھر) مشرک نہ بن جانا۔ یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں فرقے پیدا کر لئے اور خود بھی ایک گروہ بن بیٹھے۔ پھر ان میں سے ہر ایک فرقے کی یہ حالت ہو گئی کہ وہ اپنے طریقہ (کو

حق سمجھ کر اس) میں مگن ہو گیا۔ آپ نے غور کیا کہ قرآن نے کس طرح نصب العین کی وحدت کو توحید اور نصب العین کے اختلاف کو شرک قرار دیا ہے۔ یہ اس لئے کہ مسلمان ایک اُمت بنتے ہی نصب العین کی وحدت سے ہیں۔ جب مختلف گروہوں کے سامنے نصب العین مختلف ہو گئے تو ایک دوسرے سے الگ الگ ہو گئے۔ یہ ایک اُمت نہ رہے۔ ان کی وحدت ٹوٹ گئی۔ ان میں توحید کی جگہ شرک آ گیا۔ مسلمانوں کا نصب العین قرآنِ کریم ہے۔ وہ ایک ایسی کتاب ہے جس میں کوئی اختلافی بات نہیں۔ اسی سے مسلمان ایک اُمت بنتے ہیں۔ یہی ہماری آئیڈیالوجی ہے۔ اس کی خاطر ہم نے پاکستان حاصل کیا تھا۔

آپ کہیں گے کہ ان کے لئے پاکستان حاصل کرنے کی ضرورت کیا تھی؟ قرآنِ کریم ہمارے پاس اس وقت بھی موجود تھا۔ جب ہم متحدہ ہندوستان میں رہتے تھے۔ یہ ٹھیک ہے۔ لیکن اس وقت ہم قرآنِ کریم پر عمل نہیں کر سکتے تھے۔ قرآنِ کریم زندگی کا ضابطہ ہے۔ یہ قانون کی کتاب ہے۔ جیسا کہ پہلے خطبہ میں بتایا گیا تھا، اس میں خدا نے مستقل اقدار یا نہ بدلنے والے اصول دیئے ہیں تاکہ ہم ان کے مطابق زندگی بسر کریں۔ لیکن ان اصولوں کے مطابق زندگی بسر نہیں ہو سکتی جب تک اپنی حکومت نہ ہو۔ ہم نے اسی مقصد کے لئے پاکستان کا مطالبہ کیا تھا کہ ہم اپنی مملکت میں قرآنِ کریم کی مستقل اقدار کو قانون بنا کر نافذ کر سکیں اور اس طرح اپنی زندگی کو اس کے قالب میں ڈھال سکیں۔ قرآنِ کریم نے مومن اور کافر میں فرق ہی یہ بتایا ہے کہ مومن وہ ہیں جو قرآن کریم کے مطابق حکومت قائم کرتے ہیں۔ جو ایسا نہیں کرتے وہ کافر ہیں: وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۴۴﴾ (5:44) جو خدا کی نازل کردہ کتاب کے مطابق فیصلے نہیں کرتے۔ سو وہی لوگ کافر ہیں۔

مومن کے معنی ہیں ماننے والا اور کافر کے معنی ہیں نہ ماننے والا۔ انکار کرنے والا۔ یعنی جو لوگ قرآنِ کریم کو بطور نصب العین یا آئیڈیالوجی کے مانتے ہیں اور پھر اسی کے مطابق مملکت قائم کرتے ہیں، وہ مومن ہیں۔ جو لوگ قرآنِ کریم کو اپنی زندگی کا نصب العین یا آئیڈیالوجی نہیں مانتے اور اس کے مطابق مملکت قائم نہیں کرتے وہ مومن نہیں کافر ہیں۔

ان تصریحات سے یہ بات واضح ہو کر سامنے آ گئی کہ:

(1) افراد اس وقت تک قوم نہیں بنتے جب تک ان کے سامنے ایک گول۔ ایک نصب العین یا ایک آئیڈیالوجی نہ ہو۔

(2) جو لوگ قرآنِ کریم کو اپنی زندگی کا نصب العین مانتے ہیں، انہیں مسلمان کہتے ہیں اور وہ اس نصب العین کی وحدت سے ایک قوم یا اُمت بنتے ہیں۔

(3) قرآنِ کریم کو زندگی کا نصب العین رکھنے سے مطلب یہ ہے کہ اس کے مطابق حکومت قائم کی جائے۔

(4) ہم نے اسی مقصد کے لئے پاکستان کا مطالبہ کیا تھا اور اس کے لئے اُسے حاصل کیا تھا۔

لیکن پاکستان حاصل کرنے کے بعد ہم بالکل بھول گئے کہ ہماری آئیڈیالوجی کیا ہے۔ ہمارا نصب العین کیا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ جب لوگوں کو اپنا نصب العین ہی یاد نہ رہے تو وہ افراد کی حیثیت سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ ایک قوم کبھی نہیں بنتے۔

دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ ہم پاکستان بننے کے بعد، ایک قوم بنے ہی نہیں۔ ہم میں اجتماعی زندگی آئی ہی نہیں۔ ہم ایک ٹیم کی حیثیت سے میدانِ عمل میں اُترے ہی نہیں۔ ہم میں سے کسی کھلاڑی کو پتہ ہی نہیں کہ اس کا گول کون سا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم میں سے ایک کھلاڑی کی کک ایک طرف کو لگتی رہی ہے اور دوسرے کی دوسری طرف کو۔ یہ وجہ ہے کہ ہم زندگی کے میدان میں کوئی بازی نہیں جیت سکے۔

لیکن اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ پاکستان کی سرزمین ہمارے پاس ہے اور اللہ کا شکر ہے کہ بالکل محفوظ شکل میں ہمارے پاس موجود ہے۔ ہماری آئیڈیالوجی، یعنی قرآنِ مجید ہمارے پاس موجود ہے اور وہ بھی بالکل محفوظ شکل میں موجود ہے۔ ضرورت صرف اس کی ہے کہ ہم اسے اپنی حکومت کا نصب العین بنالیں۔ اس سے ہم ایک اُمت بھی بن جائیں گے اور صحیح اسلامی زندگی بھی بسر کرسکیں گے۔

چھٹا خطبہ:

حکومت تمام اُمت کی ہوتی ہے

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ ط ---

(3:109)

ترجمہ: تم سب سے اچھی اُمت (قوم) ہو جسے نوعِ انسانی کی بھلائی کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ تم اچھے کاموں کا حکم دیتے ہو اور بُرے کاموں سے روکتے ہو۔ اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

پچھلے خطبہ میں یہ بتایا گیا تھا کہ افراد، اس وقت قوم بنتے ہیں جب ان سب کے سامنے ایک نصب العین ہو۔ اسے کھیل کی مثال سے سمجھایا گیا تھا جس میں گیارہ کھلاڑی ہوتے ہیں اور ان سب کے سامنے ایک گھول ہوتا ہے۔ ہم نے یہ بھی بتایا تھا کہ ان کھلاڑیوں میں سے کوئی دائیں کی طرف ہوتا ہے کوئی بائیں کی طرف، کوئی آگے، کوئی پیچھے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ ان کھلاڑیوں کی اپنی اپنی مرضی پر موقوف ہوتا ہے کہ جس کا جہاں جی چاہے کھڑا ہو جائے اور جو کچھ جی میں آئے کرنے لگ جائے؟ ظاہر ہے کہ اس طرح بڑی ہڑبونگ مچ جائے گی۔ کھیل کے میدان میں عجیب بے ہنگم قسم کی افراتفری پھیل جائے گی۔ ایک ہی ٹیم کے کھلاڑیوں میں جھگڑے شروع ہو جائیں گے۔ جہاں ایک کھلاڑی کھڑا ہے وہاں دوسرا کھلاڑی کھڑا ہونا چاہے۔ وہ اپنی جگہ چھوڑنا نہ چاہے۔ یہ اس کی جگہ لینا چاہے۔ دونوں میں دھینگا مشتی شروع ہو جائے۔ بجائے اس کے کہ یہ دوسری ٹیم کا مقابلہ کریں، خود آپس میں ہی الجھتے رہیں۔ ایسی صورت سے بچنے کے لئے یہ کھلاڑی اپنے میں سے سب سے اچھے کھلاڑی کو اپنا کپتان چن لیتے ہیں اور یہ عہد کر لیتے ہیں کہ وہ سب اس کپتان کی بات مانیں گے۔ اس بات کا فیصلہ کپتان کرتا ہے کہ کون کھلاڑی کس جگہ کھڑا ہو۔ کس کے ذمے کس قسم کا کام لگایا جائے۔ یہی ان سب کی ڈیوٹیاں لگاتا ہے۔ یہی ان

کے جھگڑوں کے فیصلے کرتا ہے۔ اس طرح یہ کھلاڑی ایک ٹیم بنتے ہیں۔

جو صورت کھلاڑیوں کی ہے وہی ایک قوم یا اُمت کی ہے۔ اُمت کے افراد کبھی اُمت کی شکل میں نہیں رہ سکتے اگر ان کا کوئی کپتان نہ ہو۔ اُمت کے افراد اپنے میں سے بہترین فرد کو چن کر اپنا بڑا مان لیتے ہیں اور سب اس کی ہدایات کے مطابق چلتے ہیں۔ اس سے ان میں باہمی نظم اور ضبط قائم رہتا ہے۔ اس سے وہ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنے کے اہل بنتے اور اپنی منزلِ مقصود تک پہنچتے ہیں۔ قوم کے اس بڑے فرد کو آج کل کی اصطلاح میں صدرِ مملکت یا (Head of The State) کہتے ہیں۔ یعنی مملکت کا سربراہ۔ ہماری اصطلاح میں اُسے خلیفۃ المسلمین یا امیر المومنین کہا جاتا ہے۔ سوال اصطلاح کا نہیں۔ حقیقت کا ہے، اور حقیقت یہی ہے کہ وہ اُمت کا بہترین فرد۔ اُمت کا چنا ہوا۔ اُمت کی ٹیم کا کپتان ہوتا ہے۔

ٹیم اور اس کے کپتان۔ یا قوم اور مملکت کے سربراہ کا معاملہ عجیب ہوتا ہے۔ ٹیم کا کپتان، ٹیم سے باہر کھڑا ہو کر حکم نہیں چلاتا۔ وہ گیارہ کھلاڑیوں میں سے ایک کھلاڑی ہوتا ہے۔ وہ انہی کی طرح ٹیم کے اندر ٹیم کے ساتھ مل کر کھیلتا ہے۔ وہ جب ڈیوٹیاں تقسیم کرتا ہے تو اپنے ذمے بھی ایک ڈیوٹی لیتا ہے۔ وہ اس ڈیوٹی کو ایک عام کھلاڑی کی طرح سرانجام دیتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ساری ٹیم کو مناسب ہدایات بھی دیتا رہتا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو ٹیم کے کپتان کو دُہرے فرائض سرانجام دینے پڑتے ہیں۔ یہی حالت اُمت کے سربراہ کی ہے۔ وہ اُمت کا ایک فرد۔ یا یوں سمجھئے کہ مملکتِ پاکستان کا ایک عام شہری ہوتا ہے اور اس کے ذمے وہ تمام فرائض ہوتے ہیں جو دوسرے شہریوں کے ذمے ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ اس کے ذمے یہ کام بھی ہوتا ہے کہ وہ ساری قوم کی سربراہی کرے۔ انہیں مناسب ہدایات دے اور اس کا اطمینان کرے کہ ہر فرد اپنا اپنا فریضہ صحیح طور پر ادا کر رہا ہے۔ اس لئے اُسے باقیوں کے مقابلہ میں کئی گنا زیادہ کام کرنا پڑتا ہے۔

لیکن کپتان مقرر کر لینے کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ باقی کھلاڑی اطمینان سے بیٹھ جائیں اور سمجھ لیں کہ سارا کام کپتان خود ہی کرے گا۔ وہی گول کرے گا اور وہی اکیلا مقابل ٹیم کو شکست دیدے گا۔ بالکل نہیں۔ جب تک ٹیم کا ہر ایک کھلاڑی اپنی اپنی ڈیوٹی صحیح طور پر سرانجام نہیں دے گا۔ ٹیم کبھی جیت نہیں سکے گی۔ اور کوئی کھلاڑی اپنی ڈیوٹی صحیح طور پر سرانجام نہیں دے سکتا جب تک وہ کپتان کی ہدایات کی اطاعت نہ کرے۔ لہٰذا

(1) ٹیم کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے میں سے بہترین فرد کو اپنا کپتان چُنے۔

(2) کپتان کا کام یہ ہے کہ وہ ٹیم کو بہترین ہدایات دے اور

(3) ٹیم کے ہر کھلاڑی کا کام یہ ہے کہ وہ کپتان کی ہدایت کے مطابق اپنا فریضہ سرانجام دینے میں پوری پوری کوشش کرے۔

جو ٹیم اس طرح کرے گی وہ کامیاب ہو جائے گی۔ پھر یہ چیز بھی قابلِ غور ہے کہ ٹیم کی جیت، کپتان کی جیت اور ٹیم کی ہار

کپتان کی ہار نہیں کہلاتی۔ جیتتی بھی ٹیم ہے اور ہارتی بھی ٹیم ہے۔ یہی حالت قوم کی ہے۔ اگر کوئی قوم اپنا سربراہ اچھا نہیں چنتی۔ اگر وہ سربراہ صحیح ہدایات نہیں دیتا۔ اگر قوم کے افراد اپنے سربراہ کی ہدایات کی اطاعت نہیں کرتے تو زندگی کے میدان میں اس قوم کو مخالف اقوام کے مقابلہ میں شکست ہوجاتی ہے۔ یہ شکست ساری قوم کی ہوتی ہے۔ جس طرح جیت ساری قوم کی جیت ہوتی ہے۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ قوم کا سربراہ جو فیصلے کرتا ہے وہ اس کے ذاتی فیصلے نہیں ہوتے بلکہ ساری قوم پر ان کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ وہ ساری قوم کے فیصلے ہوتے ہیں۔ قوم کا سربراہ جو معاہدات دوسری اقوام سے کرتا ہے وہ بھی اس کے ذاتی معاہدات نہیں ہوتے۔ ان کی ذمہ داری پوری قوم پر عائد ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُمتِ مسلمہ کے متعلق قرآنِ کریم کہتا ہے کہ: وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (42:38)۔ ان کی حکومت باہمی مشورہ سے ہوتی ہے اور اسی لئے، جیسا کہ اُس آیت میں کہا گیا ہے جو شروع میں تلاوت کی گئی ہے، قرآنِ کریم نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر (یعنی بھلائیوں کے حکم دینے اور برائیوں سے روکنے) کا فریضہ، ساری اُمت کا قرار دیا ہے۔ صرف اُمت کے سربراہ کا فریضہ قرار نہیں دیا۔ گویا ایک اسلامی حکومت کی طرف سے جس قدر احکامات نافذ ہوتے ہیں، وہ ساری اُمت کی طرف سے نافذ شدہ احکام سمجھے جاتے ہیں۔ وہ حکومت ساری اُمت کی ہوتی ہے۔ کسی خاص گروہ یا خاص فرد کی حکومت نہیں ہوتی۔

اس ضمن میں ایک اہم بات اور بھی قابلِ غور ہے۔ کیا ٹیم کے کپتان کو اس کا حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ جس قسم کا حکم جی میں آئے دیدے یا اس پر بھی کوئی پابندی عائد ہوتی ہے؟ اس بات کے سمجھنے کے لئے ایک فٹ بال کے کھیل کو پھر سے سامنے لایئے۔ اس میں ایک قاعدہ یہ ہے کہ بال کو ہاتھ نہ لگنے پائے۔ اگر کسی کھلاڑی کا بال کو ہاتھ لگ گیا تو وہ مجرم سمجھا جائے گا۔ ٹیم کے کپتان کو اس کا حق حاصل نہیں ہوتا کہ وہ کسی کھلاڑی سے یہ کہہ دے کہ تم بال کو ہاتھ سے بھی چھو سکتے ہو۔ وہ ایسا کبھی نہیں کرسکتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کپتان کے اختیارات اُن قاعدوں کے ماتحت ہوتے ہیں جو کھیل کے لئے بطور اصول اختیار کئے جاتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے خطبہ میں بتایا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں ایسی مستقل اقدار یا اصول دیئے ہیں جن میں کبھی ردوبدل نہیں ہوسکتا۔ اسلامی مملکت ان مستقل اقدار یا نہ بدلنے والے اصولوں کو عملاً نافذ کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے۔ اس لئے اسلامی مملکت کے سربراہ کو اس کا حق حاصل نہیں ہوتا کہ وہ ان اصولوں میں کسی قسم کا ردوبدل کرسکے یا ان کے خلاف کوئی حکم نافذ کرسکے۔ وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ (6:34)۔ خدا کی باتوں کو کوئی بدلنے والا نہیں۔ اس لئے حکومت کا سربراہ یا کوئی اور، نہ تو ان مستقل اصولوں میں کوئی ردوبدل کرسکتا ہے اور نہ ہی ان کے خلاف کوئی حکم دے سکتا ہے۔ یہ زندگی کے میدان کے اٹل قانون ہیں۔ ان کی پابندی ہر حال میں ضروری ہوتی ہے۔

ایک بات اور بھی قابلِ غور ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے، فٹ بال کے کھیل کا ایک قاعدہ یہ ہے کہ بال کو کسی کا ہاتھ نہیں لگنا چاہئے۔ اس قاعدے سے کوئی مستثنیٰ نہیں ہوتا۔ یعنی یہ نہیں ہوسکتا کہ کھلاڑیوں کو تو اس کی اجازت نہ ہو کہ وہ بال کو ہاتھ لگا سکیں

لیکن کپتان کا جی چاہے تو بال کو پاؤں سے کک لگا دے اور جی چاہے تو ہاتھ سے پکڑ لے۔ بالکل نہیں، قاعدے کی پابندی ہر ایک کو یکساں طور پر کرنی ہوتی ہے۔ یہی صورت اسلامی حکومت کی ہے۔ اس میں خدا کے مقرر کردہ اصول ہر ایک پر یکساں طور پر نافذ ہوتے ہیں۔ مملکت کی بڑی سے بڑی ہستی بھی ان اصولوں سے بالا نہیں ہوتی۔ اور تو اور، خود حضور نبی اکرم ﷺ کی زبانِ مبارک سے کہلوا دیا گیا کہ: اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ (6:163)۔ ''میں اُن میں سب سے پہلا ہوں جو قوانینِ خداوندی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے والے ہیں۔''

اس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ اسلامی مملکت میں، مملکت کے سربراہ کو باقی افرادِ اُمت کے مقابلہ میں کوئی خصوصیت یا رعایت حاصل نہیں۔ وہ خدا کے مقرر کئے ہوئے اصولوں میں ردوبدل نہیں کرسکتا۔ وہ ان کے خلاف کوئی حکم صادر نہیں کرسکتا۔ اسے سب سے پہلے ان قوانین کی اطاعت کرنی ہوتی ہے۔ وہ اگر ان کی خلاف ورزی کرے تو اس سے بھی اسی قسم کا مواخذہ ہوگا جس قسم کا مواخذہ قوم کے ایک عام فرد سے ہوگا۔ اور اسے بھی اُسی قسم کی سزا ملے گی۔ چنانچہ خود حضور رسالت مآب ﷺ کی طرف سے اعلان کردیا گیا کہ: قُلْ اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ﴿۱۵﴾ (6:15) ان سے کہہ دو کہ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو میں ایک بڑے دن (یعنی مکافاتِ عمل کے وقت) سے ڈرتا ہوں۔

ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ اسلامی مملکت میں:

(1) افرادِ اُمت اپنے میں سے بہترین فرد کو اپنا سربراہ چُن لیتے ہیں۔

(2) وہ سربراہ مملکت کے تمام اختلافی معاملات طے کرتا ہے۔

(3) افرادِ اُمت پر اس کے فیصلوں کی پابندی ضروری ہوتی ہے۔

(4) لیکن وہ اپنے فیصلوں میں ڈکٹیٹر نہیں ہوتا۔ اُسے ان اصولوں کی پابندی کرنی ہوتی ہے جو خدا کی طرف سے قرآنِ کریم میں دیئے گئے ہیں۔

(5) اس بارے میں اس میں اور ایک عام فردِ اُمت میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔

اس اعتبار سے دیکھئے تو اسلامی حکومت کسی فرد یا کسی گروہ کی حکومت نہیں ہوتی۔ وہ ساری کی ساری قوم (یا اُمت) کی حکومت ہوتی ہے۔ اور اس میں تمام فیصلے، احکام اور قوانین، خدا کے مقرر کردہ اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے مرتب ہوتے ہیں۔ ان کی خلاف ورزی کوئی نہیں کرسکتا۔ اس طرزِ حکومت کا اثر دنیا کے دوسرے انسانوں پر کیا پڑتا ہے اور یہ حکومت باقی حکومتوں کے مقابلہ میں سب سے اچھی کیوں ہوتی ہے۔ اس کی بابت کبھی پھر بتایا جائے گا۔ والسلام

(مطبوعہ ماہنامہ طلوعِ اسلام 1979ء)

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی
www.azharabbas.com
khawaja.azharabbas@gmail.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قرآن پر اعتراضات کے جوابات

پناہ بلندی و پستی توئی ھمہ نیستند آنچہ ہستی توئی
شب زندگی کو سحر کرنے والے ہر ایک دور کی روشنی تیرا نام
کب تک کروں میں ضبط آہ، اب چل رے خامہ بسم اللہ، اب

چند سال پیشتر نیو یارک، امریکہ سے ایک کتاب Leaving Islam کے نام سے طبع ہوئی تھی یہ کتاب ابن وراق نے Edit کی ہے یہ ان کا فرضی نام ہے انہوں نے آج سے کافی عرصہ پیشتر ایک کتاب Why i am not a Muslim تصنیف کی تھی۔ موجودہ زیر نظر کتاب میں جناب ابن وراق صاحب نے ان لوگوں کے مضامین طبع کئے ہیں جو مسلمان گھرانوں میں پیدا ہوئے تھے، پیدائشی طور پر مسلمان تھے لیکن ہوش سنبھالنے کے بعد اسلام چھوڑ دیا ہے۔ یہ تقریباً 25 حضرات ہیں جن کا تعلق پاکستان، ایران، بنگلہ دیش، ترکی، انڈونیشیا، مراکش اور بھارت سے ہے۔ اپنے ان مضامین میں انہوں نے اسلام ترک کرنے کی وجوہات تحریر کی ہیں۔ ان حضرات میں سے ایک صاحب وہ بھی ہیں جن کے ہم نیاز مند ہیں انہوں نے اپنی آخرت ''سنوارنے'' کے لئے اس ''کارِ خیر'' میں حصہ لیا ہے اور اپنا ایک مضمون اس ''قیمتی کتاب'' میں شامل کرایا ہے۔

یہ ہمارے عزیز محترم علمی دنیا میں بڑا مقام رکھتے ہیں۔ بالغ نظر ہیں، مغربی علوم کا گہرا مطالعہ کیا ہے، قرآن سے بھی واجبی اور سبلی سا تعلق ہے۔ عرصہ دراز سے مغرب میں ہیں۔ انہوں نے، ان کے بقول، قرآن کو عقل کے معیار پر جانچا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ یہ دور پہلا دور ہے جس میں مغرب اور امریکہ کے دانشور اس کو عقلی طور پر جانچ رہے ہیں ان حضرات کے لیے قرآن کا بھی یہ دعویٰ ہے کہ:

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ؕ (41:54)

ترجمہ: ہم عنقریب ہی اپنی نشانیاں اطراف عالم میں اور خود ان کے نفوس میں دکھا دیں گیا۔ یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ قرآن حق ہے یہ لوگ پوچھتے ہیں کہ اس کا کیا ثبوت کہ یہ کتاب خدا کی طرف سے ہے فرمایا اس کا یہ ثبوت ہے کہ

حقائقِ کائنات پر جو پردے پڑے ہیں علم انسانی جوں جوں اس پر سے پردہ اٹھائے گا اور جو حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آتی جائے گی وہ قرآن کریم کے کسی نہ کسی دعویٰ کا ثبوت ہوگی۔ اصل یہ کہ قرآن کا دور ہی اب آیا ہے اس کو علمی طور پر test کرنے کا دور اب شروع ہوا ہے ہر انقلاب اپنے دور سے پیشتر واقع ہوتا ہے۔ نزول قرآن کے وقت ہر طرف روح اور روحانیت کا دور دورہ تھا روح کا تصور مذہب میں ہوتا ہے اس کی پرورش اور اس کا تزکیہ پرستش سے ہوتا ہے پرستش کے نتائج مرنے کے بعد ملتے ہیں اس لئے اس دنیا میں اس کا اندازہ نہیں ہوسکتا کہ کونسا مذہب درست ہے اور کہ کونسا مذہب درست نہیں ہے۔ جب کوئی قوم روحانیت کے گرداب میں پھنس جاتی ہے پھر وہ اس سے باہر نہیں نکل سکتی اور دنیا سے اسی قدر تنفر اس کا بڑھتا جاتا ہے مذہب اس دنیا کے مسائل حل کرنے کا دعویٰ نہیں کرتا۔ مذہب کا اس وجہ سے بھی معلوم نہیں ہوسکتا کہ کونسا مذہب غلط یا صحیح ہے اس کے برخلاف قرآن کریم ذات انسانی، یا نفس انسانی کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس نفس انسانی کی پرورش کرنا انسان کا مقصد حیات بتاتا ہے۔ قرآن کریم ذات انسانی کو دین کی اساس قرار دیتا ہے اور اس کی پرورش اور اسکا تزکیہ کا طریقہ قرآنی نظام کی اطاعت قرار دیتا ہے۔ پرستش کے نتائج مرنے کے بعد آتے ہیں۔ اطاعت کے نتائج اس دنیا میں سامنے آتے ہیں قرآن کریم نے فرمایا: قُلْ لَّا تُقْسِمُوْا ۚ طَاعَةٌ مَّعْرُوْفَةٌ ؕ (24:53) ان سے کہو قسمیں کھانے کی ضرورت نہیں ایمان کے دعویٰ کی پہچان تو بڑی آسان ہے اور وہ پہچان یہ ہے کہ طاعۃ معروفہ، باتیں نہیں اطاعت یعنی ایسی اطاعت جو پہچانی جاسکے نظر آئے کہ اطاعت ہو رہی ہے۔ اطاعت کے نتائج سامنے آتے ہیں۔ قرآن نے روح، روحانیت اور پرستش کی تردید کی ہے۔ دنیا میں پہلی مرتبہ انسانیت کو ایک ایسے نظام سے متعارف کرایا جس میں سب سے زیادہ انسانیت کی تکریم ہے اس لئے اس نظام میں ایک انسان کی حکومت کو دوسرے انسانوں پر حرام قرار دیا گیا ہے جو انسان دوسرے انسان کی حکومت بخوشی اختیار کرتا ہے وہ ننگِ انسانیت ہے۔

من نہ دیدم کہ سگے پیش سگے سر خم کرد

یہ انسان خوئے غلامی میں کتے سے بدتر ہے کیونکہ میں نے نہیں دیکھا کہ ایک کتا دوسرے کتے کی اطاعت کرتا ہو۔ اس نظام میں اطاعت صرف قانون کی ہوتی ہے اس نظام میں اسکا صدر سب سے زیادہ قانون کا مطیع و فرمانبردار ہوتا ہے اور دوسروں سے اس نظام کی اطاعت کراتا ہے چونکہ انسانوں کو قانون سازی کا اختیار نہیں اس لئے وہ اپنی اطاعت نہیں کرا سکتے (5:45، 5:46، 5:47) اس نظام کے جو نتائج دنیا میں آئے وہ سب کی آنکھوں کے سامنے ہے۔

مسلمانوں سے غلطی یہ ہوئی کہ قرآنی نظام کے روشن اور درخشندہ نتائج آنے کے باوجود انھوں نے اس نظام کو ترک کر دیا۔ اور روحانیت کے عقیدہ کو اختیار کر لیا روحانیت کے جو نتائج برآمد ہوتے ہیں وہ نتائج برآمد ہوئے۔ پوری قوم روحانیت تصوف میں ڈوبی ہوئی ہے۔ بڑے بڑے اولیاء اللہ کے مزارات، ہر جگہ پرستش ہی پرستش، نفلیں تہجد عمرے اعتکاف تبلیغی دورے زہرہ گداز، ریاضتیں الہام القاء کشف رویائے صادقہ، استخارے یہ سب قرآن کے خلاف سازشیں، خدا سے براہ راست علم حاصل کرنے کے طریقے تاکہ قرآن کی کوئی اہمیت باقی نہ رہے۔ یہ سب سوچی سمجھی سکیموں کے ماتحت ہوا۔ بنو عباس

نے چھ سو سال حکومت کی اور اسی دور میں ہمارا سارا لٹریچر تحریر کیا گیا۔ ہر خلیفہ کی ماں ایرانی تھی۔ آپ کمپیوٹر پر گوگل پر Majoosi Worship مجوسی ورشپ تحریر کر کے اس کو سرچ کریں صدقہ، درود وغیرہ اس میں آجائیں گے یہ سب مجوسیوں کے ہاں سے ہمارے ہاں آیا ہے۔

حجتہ الاسلام والمسلمین محمد، بن محمد، بن محمد، الغزالی غیر عرب تھے ایرانی تھے طوس کے رہنے والے تھے اب اس کا نام طوس کے بجائے مشہد ہے کیونکہ وہاں حضرت امام موسیٰ رضا علیہ السلام کا مزار ہے۔ شروع میں فلسفی تھے اور فلسفہ میں بڑا مقام رکھتے تھے مقاصد الفلاسفہ نام کی ایک کتاب تصنیف فرمائی جو فلسفہ میں ان کے بلند مقام کی تصدیق کرتی ہے یہ کتاب اب بھی ایم اے کی کلاسز میں تجویز کی گئی ہے ایک ہی مرتبہ اچانک روحانی ہو گئے جو کچھ نصف زندگی میں پڑھا پڑھایا اس سب کی تردید کر دی اور اس کے لئے ایک کتاب تہافتہ الفلاسفہ تحریر کی فلسفہ پر اکیس اعتراضات وارد کر کے فلسفہ کے پرخچے اڑا دئے امام غزالی نے جو کچھ ابتدائی نصف عمر میں پڑھا اس کی تبلیغ کی بعد میں نصف عمر اس کی تردید میں گزار دی۔ ساری عمر کا نتیجہ صفر۔ انہوں نے روحانیت کو بہت ہوا دی اور مسلمانوں اور اسلام کو سخت نقصان پہنچایا۔

نثر کی نسبت نظم کی زباں اپنی طرف کھینچتی (attract) ہے۔ وحدت الوجود، تصوف، روحانیت محی الدین ابن عربی اور امام غزالی کے تمام نظریات سے لیس ہو کر مولانا روم میدان میں اترے اور اپنی مثنوی تحریر کی یہ بہت مقبول ہوئی دنیا کا کوئی مسلمان ملک نہیں جہاں مثنوی کی پزیرائی نہ ہوئی ہو اسکو فارسی کا قرآن قرار دیا گیا۔

اور کتاب مثنوی شریف نے روحانیت کے عقیدے کو گھر گھر پہنچا دیا۔ ہم روحانیت اور نفس انسانی انکے مابین فرق انکے ثمرات نقصانات کے متعلق آگے ذکر کریں گے پہلے ہم عزیز محترم کے اعتراضات کو لیتے ہیں انکے جوابات کے بعد ہم اصل مضمون شروع کریں گے اور عرض کریں گے کہ قرآن نے انسانیت کو کیا دیا۔ جو روشنی کسی جگہ بھی آج نظر آرہی ہے یہ سب قرآن کا صدقہ ہے۔

قرآن پر اعتراض کرنے والوں کی عام روشن کے مطابق ہمارے محترم نے بھی قرآن میں عورتوں کے مقام اور انکے حقوق سے بات شروع کی ہے عورتوں کے حقوق اور مقام کے بارے میں انہوں نے ایک ہی مقام پر 230 صفحہ پر سات اعتراضات تحریر کئے ہیں ہم ان سب کا جواب ترتیب وار عرض کرتے ہیں پھر اصل مضمون شروع کریں گے۔ ہم ان کے اعتراضات علی الترتیب تحریر کرتے ہیں۔

1۔ تعداد ازواج۔

2۔ ازواج مطہرات، اور حضرت عائشہؓ کی عمر کا مسئلہ۔

3۔ عورتوں کے پردے کا مسئلہ۔

4۔ عورتوں کو کئی شادیوں کی اجازت کیوں نہیں۔

5۔ عورتوں کا مرتبہ مردوں سے کم کیوں ہے۔

6۔عورتوں کی وراثت نصف کیوں ہے اس سلسلے میں انہوں نے سورہ النساء کی 34 ویں آیت دی ہے۔

7۔عورتوں کی شہادت کم کیوں ہے۔

یہ بات بھی خیال شریف میں رہے کہ نزول قرآن کے وقت تمام مذاہب اور معاشروں میں عورت کا کیا مقام تھا اور ان کے تقابل میں قرآن نے کیا مقام دیا نزول قرآن سے پیشتر اور نزول قرآن کے دوران بھی عیسائیت کا بہت بڑا اثر تھا۔عیسائیت کی رہبانیت میں عورتوں کا بڑا گھناؤنا تصور موجود تھا عقیدہ تھا کہ عورتیں ہی تمام جرائم ومکروہات کا سرچشمہ ہیں کیوں کہ عورت نے ہی آدم کو بہکا کے جنت سے نکلوایا تھا عورت کو ابلیس کا پیکر سمجھا جاتا تھا کیوں کے انکے خیال میں دنیا میں شر ان ہی کی وجہ سے باقی ہے عورت کو تمام برائیوں کا مجسمہ اور سخت قابل نفرت خیال کیا جاتا تھا۔عیسائیت کا ایک عقیدہ یہ بھی تھا کہ عورت کی روح نہیں ہوتی ایران میں عورتوں کے متعلق یہ تصور تھا۔

اگر نیک بودے سر احوالِ زن زناں را مزن نام پودے نہ زن

زن کے معنی مارنا ہے یہ مصدر ہے زن کے معنی مار ہے شاعر کہتا ہے اگر عورت کی سرشت نیک ہوتی تو اسکا نام زن (مارو) نہ ہوتا بلکہ اس کا نام مزن (اسکو نہ مارو) ہوتا ایک اور شاعر نے کہا۔

چہ خوش گفت جمشید بارائے زن کہ یا پردہ یا گور بہ جائے زن

شعر آسان ہے اس کا ترجمہ تحریر کرنے کی ضرورت نہیں۔عورتوں کی نفرت پر مشتمل بیشمار اشعار فارسی زبان میں ہیں عیسائیوں میں، اور ان کے اثر سے خود مسلمانوں کا یہ عقیدہ عام ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو مٹی سے پیدا کیا اور اس کی پسلی سے حوا کو نکالا جو اس کی بیوی تھی اس سے یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ آگے نسل کیسے بڑھائیں اور اسکے بہن بھائیوں کی شادی کیسے کریں اس کا مفسرین نے حل نکالا ہے لیکن جو بات غور کرنے کی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حوا کو آدم کی پسلی سے کیوں نکالا۔کیا اس کے پاس مٹی کی کمی تھی۔حوا کا پتلا اور مٹی سے کیوں نہیں بنا دیا۔آدم کی نسل کو آگے بڑھانے کے لئے یہ طریقہ بہتر تھا کہ کچھ اور مٹی استعمال میں لائی جاتی۔جہاں تک قرآن میں عورتوں کے مقام کا ذکر ہے کہ قرآن نے فرمایا: وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ (17:70) ترجمہ: اور ہم نے آدم کی اولاد کو عزت دی اور ان کو جنگل اور دریا میں سواری دی یعنی آدمی کو حسن صورت، نطق، تدبیر و حواس عنائت فرمائے۔جن سے دنیوی اور اُخروی مفاد و منافع کو سمجھتا ہے اور اچھے برے میں تفریق کرتا ہے۔ہر طرح کی ترقی کی راہیں اس پر کھولیں۔دوسری مخلوقات کو قابو میں لا کر اپنے کام نکالتا ہے خشکی میں طرح طرح کی گاڑیوں میں سفر کرتا ہے اور سمندروں میں کشتیوں اور جہازوں کے ذریعے بے تکلیف فاصلے طے کرتا ہے۔تکریم انسانیت کے اس بنیادی حق میں مومن، کافر، مرد، عورت کی کوئی تمیز و تفریق نہیں۔قرآن نے فرمایا خشکیوں اور پانیوں میں جتنی بھی فطرت کی قوتیں ہیں وہ اس کے تابع تسخیر ہیں اس تسخیر سے جس قدر خوشگوار سامان حیات ملے اس سے فائدہ اٹھانے میں مرد اور عورتیں سب شامل ہیں۔

قرآن کریم نے آدم (یعنی آدمی) کو نوع انسانی کے نمائندے کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔قرآن کریم کی رو سے انسان

کی زندگی کی ابتداء ایک لائف سیل سے ہوئی۔ قرآن نے اس کو ''نفس واحدۃ'' کہا ہے اس میں تذکیر و تانیث کا امتیاز نہیں تھا۔ یہ جرثومہ از خود دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم فرماتا ہے: الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِیْرًا وَّنِسَآءً ۚ (4:1) اللہ وہ ہے جس نے تمہیں ایک جرثومہ حیات سے پیدا کیا پھر اس جرثومہ حیات سے اس کا جوڑا بنایا پھر ان جرثومہ حیات کے امتزاج سے مردوں اور عورتوں کی بڑی تعداد پھیلا دی ہے قرآن کریم کی رو سے عورتوں اور مردوں دونوں کا سرچشمہ ءحیات ایک نفس واحدہ ہی ہے۔

عربی زبان میں زوج ساتھی کو کہتے ہیں تانگے کے دو پہیہ ایک دوسرے کے زوج ہیں قینچی کے دو پھل ایک دوسرے کے زوج ہیں قرآن نے فرمایا: جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّمِنَ الْاَنْعَامِ اَزْوَاجًا ۚ (42:11)، (30:2) ترجمہ ہم نے مردوں اور عورتوں کو ایک دوسرے کا ساتھی بنایا ہے۔ دوسرے مقام پر ارشاد ہے: بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ (3:195) ترجمہ تم مرد اور عورت ایک دوسرے میں سے ہو اسلئے تم میں سے کوئی بھی اکیلا مکمل نہیں ہوتا۔ فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۭ (4:32) ترجمہ یعنی کچھ خصوصیات کے اعتبار سے مردوں کو عورتوں پر فضیلت ہے ایک خاندان یا معاشرہ میں زندگی بسر کر رہے ہیں اگر ایک مرد زیادہ تعلیم یافتہ ہے معاشرے کے لئے زیادہ فائدہ مند ہے اسکو اس کے کنبے میں فضیلت حاصل ہوگی اگر اسکے برخلاف کسی کنبہ میں عورت زیادہ تعلیم یافتہ زیادہ باصلاحیت و باکردار ہے تو اسکو اپنے کنبہ کے لوگوں پر فضیلت ہوگی ایک دیگر مقام پر ارشاد ہے: وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ۭ (30:21) اللہ نے تم میں باہمی مودت اور رحمت بھی رکھی ہے وہ گھر جس میں شوہر اور بیوی کے درمیان بڑی ہم آہنگ زندگی گزر رہی ہے قرآن نے اس گھر کو جنت کہا ہے بیویوں کے لئے فرمایا: اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا (30:21) تمہارے لیے تمہاری قسم کے جوڑے بنائے تاکہ تم اپنی بیویوں سے سکون حاصل کر سکو اگر کسی شخص کو اپنے گھر میں اپنی بیوی سے سکون حاصل نہیں ہوتا تو اسکی شادی کا مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ قرآن نے عورتوں اور مردوں میں مشترکہ صلاحیتیں گنوائی ہیں کوئی صلاحیت ایسی نہیں جو مردوں میں ہو اور عورتوں میں نہ ہو یہ آیت بہت طویل ہے لیکن ہم اسکو صرف اسلئے تحریر کر رہے ہیں تاکہ آپکو یقین ہو جائے قرآن عورتوں میں وہ سب صلاحیتیں تسلیم کرتا ہے جو مردوں میں ہیں ہم طوالت کی وجہ سے ترجمہ نہیں لکھ رہے آپ کسی نسخہ قرآن میں خود دیکھ لیں نیز یہ کہ آیت آسان ہے آپ خود بھی سمجھ سکتے ہیں ارشاد عالی ہے: اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّاۗىِٕمِيْنَ وَالصّٰۗىِٕمٰتِ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ ۙ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ۝۳۵ (33:35) آپ غور کریں کہ قرآن کریم کسی طرح مرد اور عورت کی صلاحیتوں کو پہلو بہ پہلو بیان کر رہا ہے۔

عورتوں کے برابر کے مرتبہ اور درجہ کے متعلق قرآن میں ایک بڑی بلیغ آیت آئی ہے هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ۭ (2:187) ترجمہ وہ تمہاری پوشاک ہیں اور تم ان کی پوشاک ہو وہ تمہارے لئے بمنزلہ لباس ہیں اور تم ان

کے لئے بمنزلہ لباس ہو میاں بیوی ایک دوسرے کے ساتھ جس طرح کی وابستگی رکھتے ہیں یہ اس کی طرف اشارہ ہے اس اشارہ کو بیان کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ان دونوں میاں بیوی میں ایسا مضبوط رشتہ ہے اور ان کا چولی دامن کا ساتھ ہے کہ انکو کسی حالت میں بھی الگ الگ نہیں کیا جا سکتا میاں بیوی میں تعلق کے لئے لباس کا جو استعارہ قرآن نے استعمال کیا ہے ہم اسکی بلاغت کی طرف اشارہ کرتے ہیں لباس آدمی کی برہنگی کو چھپاتا ہے غالب نے کہا۔

ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی میں ورنہ ہر لباس میں ننگ وجود تھا

لباس جسم کی برہنگی کو چھپاتا ہے میاں بیوی اپنے باہمی عیوب دوسروں سے چھپاتے ہیں اگر کوئی شخص عیب لگاتا بھی ہے تو یہ ایک دوسرے کا defence دفاع کرتے ہیں یہ ایک حقیقت ہے کہ شوہر کو گھر لینے اسکو خوب صورت کرنے، اور اپنا آپ سنوار کر رکھنے کی خواہش بیوی کیوجہ سے ہوتی ہے اسی طرح بیوی گھر کو خوب صورت اور Decorative اسی لئے رکھتی ہے کہ اسکا شوہر اس سے تسخیر ہو مرد یا عورت میں سے کوئی ایک بھی اپنے اس فطری محرک سے محروم ہو تو ایک مسافر کی طرح بن جاتا ہے اس کا کوئی مرکز نہیں رہتا اسی طرح جو عورت اپنے شوہر سے محروم ہو جاتی ہے اس کے سارے احساسات ختم ہو جاتے ہیں یہ مرد اور عورت کا باہمی تعلق ہے جسکی وجہ سے گھریلو رونقیں بہاریں انسانیت کو نصیب ہوتی ہیں اور اسی سے دنیا میں تہذیب وتمدن ترقی کرتے چلے جاتے ہیں۔

لباس کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ لباس سردی گرمی کی سختیوں سے محفوظ رکھتا ہے۔ لباس انسان کو بیماریوں سے محفوظ رکھتا ہے چنانچہ ارشاد گرامی ہے: وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ ۚ (21:80) ترجمہ: اور ہم نے اس کو لباس کی صنعت سکھائی جو تمہیں حملہ سے محفوظ رکھتے ہیں اخلاقی پہلو سے یہی حال عورت کا مرد کے لئے ہے اور مرد عورت کے لئے شادی کے بعد دونوں میاں بیوی بدچلنی سے محفوظ ہو جاتے ہیں ان کی عصمت وعفت اور محفوظ ہو جاتی ہے۔

آپ غور فرما رہے ہیں جو مدارج ہم عورتوں کے تحریر کر رہے ہیں یہ کسی مذہب یا تمدن میں آپ کو نہیں ملیں گے سورہ بقرہ میں ارشاد ہے: وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۠ (2:228) ترجمہ اور عورتوں کا بھی حق ہے جیسا کہ مردوں کا ان پر حق ہے دستور کے مطابق۔ مردوں کو عورتوں پر ایک درجہ ہے (عدت کا) یعنی یہ بات تو حق ہے کہ جیسے کہ مردوں کے حقوق عورتوں پر ہیں ایسے ہی عورتوں کے حقوق مردوں پر ہیں جن کا قائدہ کے مطابق ادا کرنا ہر ایک پر ضروری ہے تو اب مرد کو عورت کے ساتھ بدسلوکی اور حق تلفی ممنوع ہو گئی البتہ مرد کو عورت پر ایک درجہ یہ ہے کہ عورتوں کو جو عدت کرنی پڑتی ہے وہ عدت مردوں کو نہیں کرنی ہوتی اس آیت میں فرمایا گیا کہ عورتوں اور مردوں کے حقوق وفرائض بالکل ایک جیسے ہیں سوائے اس کے کہ مردوں کو عورتوں کی طرح عدت نہیں کرنی ہوتی۔ آپ مختلف تمدنوں اور تہذیبوں پر غور کریں ہر جگہ مردوں کے حقوق کا ذکر ہوتا ہے۔ عورتوں کے حقوق کا ذکر نہیں ہوتا۔ جہاں مردوں کے حقوق ہونگے اور عورتوں کی ذمہ داریاں ہونگی ہر جگہ علیحین نمایاں دکھائی دے گا قرآن نے کہا کہ حقوق وفرائض کے بارے میں مرد اور عورتیں بالکل ایک جیسے ہیں۔

ہم نے یہاں تک عورتوں کی اس عمومی حالت کا ذکر کیا ہے جو نزول قرآن کے وقت تھی اور اب بھی اکثر مقامات پر ہے

البتہ قرآن نے جو مقام عورتوں کو دیا ہے وہ کسی دوسرے مقام پر نہیں۔اب ہم عزیز محترم کے وہ اعتراضات جو عورتوں کے بارے میں انہوں نے کئے ترتیب وار لیتے ہیں۔

1۔تعددِ ازدواج:

سب سے پہلے انہوں نے تعدد ازدواج کے بارے میں اعتراض کیا ہے۔انکا اعتراض ایک حد تک اس لئے درست ہے کہ ہمارے معاشرے میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ قرآن کے خلاف ہے۔

قرآن کے نزدیک اصول تو یہ ہے کہ عام حالات میں ایک میاں اور ایک بیوی ہو۔اصول تو ایک ہی بیوی کا ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے:وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ جَعَلَكُمْ اَزْوَاجًا ؕ (35:11) ترجمہ اور اللہ نے تم کو مٹی سے پیدا کیا پھر نطفے سے پھر تم کو جوڑے جوڑے بنایا ظاہر ہے کہ جوڑا ایک مرد اور ایک عورت کا ہی ہوتا ہے دوسرے مقام پر ارشاد ہے:فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ۝ (75:39) ترجمہ پھر کیا اس میں انسانوں میں جوڑا نر مادہ اس بارے میں ایک واضح آیت سورہ النساء میں آئی ہے فرمایا:وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ ۙ وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ (4:20) ترجمہ اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی سے نکاح کرنا چاہو تو پہلی بیوی کا مہر پورا پورا ادا کر دو اور پھر اس کی جگہ دوسری بیوی لے آؤ اس آیت نے وضاحت فرمائی کہ ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی آئے گی زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ ۙ (4:20) بیوی کی جگہ بیوی۔اس پہلی بیوی کی موجودگی میں نہیں۔چونکہ قرآن کریم کے پیش نظر ہر ملک کے حالات ہیں اس لئے وہ ہنگامی حالات کے متعلق بھی ہدایات دیتا چلتا ہے اسی سورہ مبارکہ النساء کے بالکل شروع میں ارشاد فرمایا:وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً (4:3) عربی زبان میں خود قرآن نے یتامیٰ کا معنی وہ بچے جن کے والدین فوت ہو جائیں کے علاوہ بیوہ عورتیں اور وہ عورتیں جن کے وارث نہ ہوں۔آگے چل کر قرآن نے یتامی النساء ان ہی معنوں میں استعمال کیا ہے (4:127) آیت کا مفاد یہ ہے کہ اگر ایسے حالات پیدا ہو جائیں جن میں تمہیں اس بات کا خوف ہو کہ تم یتیم بچوں اور بیوہ عورتوں کے مسئلہ کو عام حالات کے مطابق حل نہیں کر سکتے تو اس کی یہ استثنائی صورت ہے کہ تم قانون میں عارضی طور پر Relaxation کروا و ان میں سے ان عورتوں سے کہ جو تمہیں پسند کریں ان سے شادی کر لو ریاست خود اعلان کرے گی کہ قانون میں Relaxation دو بیویوں کی ہوگی ہے یا تین کی ہوگی اور اگر حالات بہت سنگین ہو گئے ہیں تو چار کی گئی ہیں بغیر ریاست کی اجازت کے دو شادیاں نہیں کر سکتے پھر دوسری شرط یہ لگائی کہ:فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً (4:3) لیکن اگر تمہیں خوف ہے کہ اس Relaxation کے باوجود یتیموں اور بیواؤں میں انصاف جاری نہیں ہو رہا ہے پھر فواحدۃ تو پھر ایک ہی نکاح کرو۔اصولی طور پر قانون ایک ہی نکاح کا ہے ایک مرد ایک بیوی قرآن میں صرف یہی ایک مقام ہے جہاں تعددِ ازدواج کی اجازت ہے اس کے علاوہ ہر جگہ زوجین کا اصول بیان کیا گیا ہے ایک میاں اور ایک بیوی۔ (جاری ہے)

خصوصی اپیل

(بے مثال تفسیرِ قرآن کی نشر و اشاعت کے لئے تعاون کی درخواست)

غلام احمد پرویز علیہ الرحمۃ نے ساری عُمر قرآن کریم کی تحقیق، تعلیم اور ترویج کرنے میں بسر کی۔ اُنہوں نے خالص قرآن کی مدد سے عصرِ حاضر کے علمی، تحقیقی، سائنسی اور تنقیدی اصولوں کی پاسداری کرتے ہوئے قرآن کے اصلی پیغام الحق کو ہم تک پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ پینتیس سال کے لگ بھگ ہفتے کے ہر جمعہ/ اتوار کو باقاعدگی سے درسِ قرآن دیا کرتے تھے۔ اُن کے دروس آڈیو/ وڈیو میں منتقل کئے جاتے تھے جن میں پورے قرآن کا بڑی تفصیل سے لگ بھگ ایک ہزار گھنٹے پر محیط جائزہ لیا گیا ہے۔ بعد میں انہی ٹیپ کی مدد سے اِن دروس کو ٹائپ کر کے مطالب القرآن فی دروس الفرقان کے نام سے کتابی شکل میں 41 ضخیم جلدوں میں شائع کر دیا گیا ہے۔

ادارہ طلوع اسلام نے اِسے تبلیغ کا فریضہ خُداوندی سمجھتے ہوئے نبھایا ہے اور احباب سے اپیل کرتا ہے کہ وہ اِن کُتب کو ادارہ سے خرید کر زیادہ سے زیادہ لوگوں اور اداروں تک اپنا تبلیغی فرض سمجھتے ہوئے پہنچائیں۔ اِس عمل میں اگر آپ ادارہ کو مطلوبہ افراد کی فہرست فراہم کر دیں گے تو وہ اس تفسیر قرآنی کا ایک سیٹ آپ کی جانب سے آپ کے دئے ہوئے پتہ پر بھجوا دے گا۔ تعلیمی اداروں میں خصوصی طور پر تعلیمی درسگاہیں اور پبلک لائبریریاں زیادہ اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔ ادارہ کے پاس اِن کی فہرست موجود ہے جو ضرورت پڑنے پر مہیا کی جاسکتی ہے۔ آپ کو اِس امر سے یہ بھی تسلی رہے گی کہ آپ نے نہ صرف اپنی طرف سے تبلیغ کا فریضہ ادا کرتے ہوئے اللہ کے کام میں رفاقت کی سعادت حاصل کی ہے بلکہ ادارے کی بھی اِس فریضہ کی ادائیگی کو جاری رکھنے میں بھرپور مدد فراہم کی ہے۔

(41) اکتالیس ضخیم جلدوں پر مشتمل اِس منفرد تفسیر کا ہدیہ مبلغ 19000 روپے ہے۔ اگر آپ یہ تفسیر کسی لائبریری یا دوست کو گفٹ کرنا چاہتے ہیں تو ادارہ کو صرف -/15000 روپے ارسال کر دیجئے۔ ادارہ آپ کی جانب سے یہ تفسیر قرآن مطلوبہ لائبریری یا فرد تک بھجوا دے گا۔ عطیات کے لئے ادارہ کا اکاؤنٹ نمبر درج ذیل ہے۔ ہماری دلی تمنا یہ ہے کہ دروس القرآن کی یہ اکتالیس (41) ضخیم جلدوں پر مشتمل قرآنِ کریم کی مکمل تفسیر پاکستان کی ہر یونیورسٹی کی لائبریری کی زینت بنے تاکہ وہاں کے تمام طالب علم قرآنِ کریم کی اس بے مثال تفسیر سے استفادہ کر سکیں۔

اللہ تعالیٰ ہماری معصوم آرزو کو شرف قبولیت بخش دے اور صاحب حیثیت لوگ اس سلسلے میں آگے بڑھیں اور اس کام میں ہماری مدد کریں تاکہ تبلیغ دین کے اس فریضہ سے ہم سب عہدہ برا ہو سکیں۔ شکریہ

Bank Account Idara Tolu-e-Islam

National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulberg Lahore

For Domestic Transactions	For International Transactions
Bank A/C No: 0465004073177672	IBAN:PK36NBPA0465004073177672 Swift Code: NBPAPKKAA02L

قرآن حکیم کے طالب علموں کے لیے خوشخبری

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے سات سو سے زائد دروسِ قرآنی پر مبنی تفسیری سلسلہ کے تحت ادارہ طلوع اسلام لاہور کی طرف سے مندرجہ ذیل تفسیری کتب کی اشاعت الگ الگ جلدوں میں ہو چکی ہے۔ یہ جلدیں 20x30/8 کے بڑے سائز کے بہترین کاغذ پر خوبصورت طباعت اور مضبوط جلد بندی کے ساتھ دستیاب ہیں۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

مطالب القرآن فی دروس الفرقان

نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	نیا ہدیہ	نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	نیا ہدیہ
سورہ الفاتحہ	(1)	240	200/-	سورۃ الانبیآء	(21)	336	300/-
سورہ الفاتحہ (سٹوڈنٹ ایڈیشن)	(1)	240	110/-	سورۃ الحج	(22)	380	350/-
سورۃ البقرہ (اول)	(2)	500	400/-	سورۃ المؤمنون	(23)	408	400/-
سورۃ البقرہ (دوم)	(2)	538	400/-	سورۃ النور	(24)	264	350/-
سورۃ البقرہ (سوم)	(2)	500	400/-	سورۃ الفرقان	(25)	389	350/-
سورہ آل عمران (اول)	(3)	472	500/-	سورۃ الشعرآء	(26)	454	400/-
سورہ آل عمران (دوم)	(3)	480	500/-	سورۃ النمل	(27)	280	300/-
سورۃ النساء	(4)	870	700/-	سورہ القصص	(28)	334	350/-
سورۃ المائدہ	(5)	450	500/-	سورہ عنکبوت	(29)	388	350/-
سورۃ الانعام	(6)	600	600/-	سورہ روم، لقمان، السجدہ	(30,31,32)	444	400/-
سورۃ الاعراف (اوّل)	(7)	480	500/-	سورہ احزاب، سبا، فاطر	(33,34,35)	570	400/-
سورۃ الاعراف (دوم)	(7)	400	500/-	سورہ یٰسٓ	(36)	164	150/-
سورۃ انفال	(8)	210	250/-	سورہ الصّٰفّٰت، ص، زمر	(37,38,39)	450	400/-
سورہ توبہ	(9)	530	550/-	سورۃ مومن، حٰمٓ سجدہ، سورہ شوریٰ	(40,41,42)	624	550/-
سورۂ یونس	(10)	360	400/-	سورۃ زخرف، دخان، جاثیہ، احقاف، محمدؐ	(43-44-45 46-47)	520	500/-
سورۃ ھود	(11)	400	400/-	سورۃ الفتح، الحجرات، ق، الذاریات، الطور، النجم	(48-49-50 51-52-53)	550	500/-
سورۃ یوسف	(12)	288	300/-	سورۂ القمر، الرحمٰن، واقعہ، الحدید	(54-55 56-57)	384	400/-
سورہ رعد، ابراہیم، الحجر	(13-15)	500	500/-	28 واں پارہ (مکمل) مجادلہ، حشر، ممتحنہ، صف، جمعہ، منافقون، تغابن، طلاق، تحریم	(58-59-60-61-62-63-64-65-66)	300	300/-
سورہ النحل	(16)	334	300/-				
سورہ بنی اسرائیل	(17)	396	400/-	29واں پارہ (مکمل)	----	544	400/-
سورۃ الکہف وسورہ مریم	(18-19)	532	500/-	30واں پارہ (مکمل)	----	624	400/-
سورہ طٰہٰ	(20)	416	350/-	شرح جاوید نامہ	----	800	1000/-

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان) فون نمبر: +92 42 3571 4546 +92 321 4460 787

بزم ہائے طلوع اسلام اور تاجر حضرات کو ان ہدیوں پر تاجرانہ رعایت دی جائے گی۔ ڈاک خرچ اس کے علاوہ ہوگا۔

ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(قسط نمبر 26)

دوقومی قرآنی نظریہ پر مطالبۂ پاکستان

چھٹا باب:

انسانی ذات کی نشوونما سے مزید ارتقائی مراحل طے کرنے کی اہلیت کا حصول

دوقومی قرآنی نظریہ پر الگ مملکتِ اسلامیہ پاکستان کا مطالبہ:

ذات/نفس کا فلسفہ میں مفہوم بیان کیا جاتا ہے کہ

1۔ معروض کے مقابلے میں موضوع

2۔ انا، عینی اور کسی چیز کا مجرد تشخص۔

3۔ ایک عمل جو اپنے طور پر عمل کرے۔

4۔ وہ جو تغیرات میں غیر متبدل رہے۔

ذات، انا، ایغو کا مفہوم ذہن/ مائینڈ کے وسیع المعانی میں شعور، آگاہی، انسان کی عقلی صلاحیت، فکر اور تفکر کی صلاحیت۔ بھی شامل ہوتی ہے، خصوصی طور پر وہ وہ جو شعوری تغیرات میں غیر متبدل رہے۔ اِس کے علاوہ وہ ہستی جو احساس، تاثر، ادراک، تفکر، تخیل، یاد، عزم و ارادہ کے وظائف انجام دے۔

نفس سے مراد انسانی جسم میں وہ غیر مادی لافانی غیر مرئی جان دار قوت یا الوہیاتی توانائی ہے جسے اللہ نے ارادہ و اختیار کی ایسی غیر معمولی طاقت عطا کر رکھی ہے جسے وہ خالق وقادر ہو کر بھی سلب نہیں کرتا۔ یہ نفس انسانی جسم کے مرنے سے بھی نہیں مرتا کیونکہ انسانی جسم مادی قوانین کے تابع کام کرتا ہے جبکہ انسانی نفس ان قوانین کے تابع نہیں ہوتا۔ جسم میں اس کی حیثیت حاکم کی ہوتی ہے۔ تمام جسمانی اعضاء عین اسی کے ارادہ واختیار کے مطابق کام کرتے ہیں۔

اللہ نے انسانی نفس کے اندر پہلے سے طے شدہ کوئی ہدایت یا گمراہی نہیں رکھی ہوتی اور نہ ہی اس کا مقدر پہلے سے متعین کر کے لکھا ہوتا ہے۔ اس لئے ہر انسان اپنے ہر عمل کا ذمہ دار بھی ہے اور بروز قیامت جوابدہ بھی ہوگا۔ واضح رہے کہ اللہ کے قانون مکافات عمل کے تحت انسان کے اختیار میں یہ چیز تو ہے کہ وہ چاہے تو آگ میں انگلی نہ ڈالے لیکن اگر وہ اس میں انگلی

ڈالے گا تو وہ لازمی جلے گی اور اسے تکلیف کا عذاب بھگتنا ہوگا۔ یعنی انسان کو یہ اختیار ہرگز نہیں دیا گیا کہ وہ اللہ کے قوانین فطرت یا ان کے نتائج کو بدل سکے۔ کوئی معجزہ کوئی کرامت نہیں ہوسکتی۔ وہ اپنے تمام فیصلے کرنے کا مکمل مجاز و بااختیار ہوتا ہے۔ اِنسان کو اپنے فیصلے کرنے کے لیے چار غیر معمولی چیزیں عطا کی گئی ہیں:

1۔ ارادہ (Will)

2۔ اختیار (Power)

3۔ عقل وفکر (Human Intellect)

4۔ وحی یا کتاب اللہ میں مذکور ابدی وغیر متبدل:

خدائی اقدار اور خدائی ہدایات وحی کی یہ اقدار و ہدایات کوئی بھی انسان اپنی عقل سے حاصل نہیں کرسکتا اس لیے انہیں اللہ نے اپنی طرف سے بذریعہ اپنے منتخب بندوں یعنی انبیاء کرام پر نازل کرکے انسانوں تک پہنچایا تاکہ انسان مذکورہ بالا چاروں عناصر سے صحیح صحیح کام لیتے ہوئے ان ابدی وغیر متبدل خدائی ضابطوں کے مطابق اپنے فیصلے وعمل کریں۔ جس کے نتیجہ میں وہ اپنی خداداد مخفی صلاحیتوں کی نشوونما کرکے ترقی کرتے ہوئے ابدی زندگی کی لامتناہی نعمتوں و کامرانیوں سے سرفراز ہوجائیں۔

انسانی ذات میں اِستحکام کی اہمیت:

واضح رہے کہ اللہ کے قانون مکافات عمل کے تحت انسان کے اختیار میں یہ چیز تو ہے کہ وہ چاہے تو آگ میں انگلی نہ ڈالے لیکن اگر وہ اس میں انگلی ڈالے گا تو وہ لازمی جلے گی اور اسے تکلیف کا عذاب بھگتنا ہوگا۔ یعنی انسان کو یہ اختیار ہرگز نہیں دیا گیا کہ وہ اللہ کے قوانین فطرت یا ان کے نتائج کو بدل سکے۔ کوئی معجزہ کوئی کرامت نہیں ہوسکتی۔

قرآن میں مذکور اللہ کی صفات کا مقصد یہ ہے کہ انسان حتی المقدور اپنے اندر ان صفات باری تعالیٰ کو منعکس کرے یا سموئے تاکہ دنیا میں ایک متوازن انسانی معاشرہ قائم ہوسکے۔ یہ تمام کاوشیں اُس کے تخلیقی اعمال کہلائیں گے اور انہی تخلیقی غیر مرئی اعمال کا مجموعہ اُس کی ذات کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ ان کی ذات کی یہ صورت نہ تو شروع ہی سے تکمیل یافتہ ہوتی ہے نہ خارج سے متعین اور ان پر مسلط کردہ۔ انسان اپنے علم اور آزادیِ ارادہ کی ودیعت کردہ صلاحیتوں سے اپنے تخلیقی انسانی اعمال میں اپنی ذات کی نشوونماء کرتے ہوئے اپنی حدود تک کے تکمیل کے عمل میں بلند کیریکٹر سے ہی انسانی خودی کا استحکام وابستہ ہے۔ کیریکٹر کی ابتداء یہاں سے ہوتی ہے کہ قانون کی حدود و قیود یعنی حدود اللہ کا تقاضا کچھ اور ہو اور آپ کے جذبات کی شدّت کا تقاضا کچھ اور ہو، لیکن آپ جذبات کو مغلوب کرکے قانون کی حدود و قیود کو ترجیح دیتے ہوئے ان کے مطابق عمل کریں یا اپنے جذبات کو، اپنے اختیار و ارادے سے حدود کے اندر رکھیں تو یہ کیریکٹر کہلاتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ جذبات کو کنٹرول میں رکھنے سے تمہاری

خودی میں استحکام پیدا ہوتا ہے۔ اب دیکھتے ہیں کہ خودی کا استحکام کیا ہے؟ جب آپ اپنے جذبات کو کنٹرول کرتے ہیں، تو آپ کے اندر کنٹرول کرنے کی ایک قوّت پیدا ہوتی ہے اور بے باک جذبات، جو تمہارے اندر ابھرتے ہیں، تم اس قوّت کے زور پر ان پہ قابو پا لیتے ہو۔ جذبات کو کنٹرول کرنے کی بار بار کی مشق سے جذبات کو کنٹرول کرنا آپ کی عادت ثانیہ بن جاتی ہے۔ یہ وہ مرحلہ ہوتا ہے کہ پھر آپ کو جذبات کو قابو کرنے میں کوئی دقّت نہیں ہوتی۔ ایک مرحلہ ایسا آتا ہے کہ آپ دل میں کسی قسم کی گرانی محسوس کیے بغیر بھی جذبات پر قابو کر لیتے ہیں۔ اس مرحلے پہ آپ کہہ سکتے ہیں کہ خودی میں، ذات میں، استحکام پیدا ہو چکا ہے۔ ایسے مرحلے کے حامل شخص کو آپ بلند کیریکٹر کا حامل کہہ سکتے ہیں۔ بے باک جذبات دراصل ابلیس و شیطان ہیں۔ ان کو مغلوب کرنے کو رسول اللہ ﷺ کی زبان میں شیطان کو مسلمان کرنا کہتے ہیں۔ جب آپ خودی کی نشوونما کی طرف جاتے ہیں تو قرآن کی اصطلاح میں اسے تزکیہ نفس کہا جاتا ہے۔ تزکیہ نفس یعنی قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کر کے خودی میں اس قدر استحکام آ جاتا ہے کہ پھر بے باک اور سرکش جذبات کو کنٹرول کرنے میں انسان کو کوئی دقّت نہیں ہوتی۔

یہ نظریہ اور اِس پر عمل کرنے کے لئے ہمیں متعدد مقامات پر اللہ کی طرف سے وحی کی شکل میں دی گئی ہیں۔

ہم اِنسانی ذات اور اِس کی نشوونماء کے تصور کی وضاحت کو اپنے دور کی علمی دنیا اور خصوصی طور پر مغرب کے مفکرین میں بھی یوں پاتے ہیں۔

انسانی ذات اور اِس کی نشوونماء پر اہم مفکرینِ مغرب کی وضاحت:

اِنسانی ذات کی نشوونماء کے متعلق مغربی مُفکرین کے مؤقف کو جاننے کے لئے اُن کے اہم مفکر اوسپینسکی وضاحت پیش کرتے ہیں کہ:

فکرِ جدید کی رو سے انسان محض مادی عناصر کا مرکب نہیں جس میں ہر آن تغیر واقع ہوتا رہتا ہے بلکہ اس کے اندر ذات (روح اور عقل) بھی ودیعت کی گئی ہے جو مستقل ہے اور اسے خارجی تغیرات سے غیر متاثر رکھا جا سکتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ ذات جو مضمر حالت میں انسان کے اندر پیدائش سے موجود رہتی ہے اس حالت میں ہمیشہ رہتی ہے یا اس میں نشوونما بھی ہوتی ہے جس کی تکمیل سے اس میں پختگی آتی جاتی ہے۔ اس کو بالفاظ دیگر اس کا ارتقاء کہا جاتا ہے یہ مفکرین اب اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ انسانی ذات میں نشوونما کے امکانات ہوتے ہیں اور اِس کی نشوونما اور تکمیل ہی درحقیقت مقصودِ زندگی ہے۔

وہ مزید وضاحت میں اگر جیف کے الفاظ میں کہتا ہے تو انسانی ارتقاء سے مفہوم یہ ہے کہ ذات کے ان قویٰ اور ممکنات کا نشوونما پانا جو از خود نشوونما نہیں پا سکتیں یعنی جن میں میکانکی طور پر بالیدگی پیدا نہیں ہوتی۔ صرف اس نہج کی نشوونما، صرف اس انداز کی بالیدگی انسان کی حقیقی ارتقاء کہلا سکتی ہے اس کے علاوہ اور کسی چیز کو انسانی ارتقاء نہیں کہا جا

سکتا ہے۔

راشڈل نے اس طرف توجہ دلائی ہے کہ تحصیل ذات کی اصطلاح جو اکثر اخلاقی زندگی کا مقصد ہے اس سے ذات کو حقیقی بنانا مراد نہیں ہوسکتا کیونکہ ذات تو پہلے ہی حقیقی ہے۔ اس سے ذات کو کامل بنانا مراد لے سکتے ہیں اور عموماً اس سے یہی مفہوم مراد ہوتا ہے۔ افعال کے سوچے سمجھے انتخاب اور غایتوں کی ارادی تلاش وجستجو ہی انسان کے کمال حاصل کرنے کا راستہ ہے، بجائے اس کے انہیں ارتقا کے فطری رویے پر چھوڑ دیا جائے۔

ایک دوسرے مُفکر گرین کے نزدیک انسان کی زندگی اور اخلاق کو سمجھنے کے لیے اس پہلو پر زور دینا چاہیے جو اس کا امتیاز ہے۔ یعنی خودشعوری جو اسے حیوان سے الگ کرتی ہے۔ اس لیے اس خوبی کو جس حد تک ترقی دی جائے گی وہ انسانی کمال ہوگا اور اس سے اخلاق کی برتری ہوگی۔ جانوروں میں اشتہا کو پورا کرنا ان کی زندگی ہے لیکن انسان میں عقل، ادراک اور جذبہ ہے جو کہ اس کی ذات سے متعلق ہے لہٰذا انسان اپنی ذات کو ترقی دے اور اسے مکمل کرے۔

گرین کے مطابق انسان جسمانی لذتوں سے آگے بڑھ کر ذہنی اور روحانی (تکمیل ذات کی) مسرتوں کی بھی تلاش کرتا ہے۔ حقیقی اور مستقل مسرتیں معاشرتی زندگی میں ظاہر ہوتی ہیں۔ تکمیل ذات بطور فرد حاصل نہیں ہوتی بلکہ معاشرے میں رہ کر اس کا حصہ بن کر ہوتی ہے۔ انسان معاشرے میں اپنی زندگی گزارتا ہے اور اپنی مسرتوں کو معاشرے میں پورا کرتا ہے۔ غرض اس کی پوری زندگی معاشرے کا ایک حصہ ہوتی ہے۔ گرین انفرادی خیر کو عالمگیر خیر کا ایک حصہ سمجھتا ہے۔

گرین تکمیل نفس کو خیر مشترک کہتا ہے۔ جو وہ دوسرے انسانوں کے ساتھ میل وجول سے حاصل کرتا ہے۔ انسان کی ذات کی تکمیل معاشرے میں اپنے فرائض پورے کرنے سے ہوتی ہے۔ انسان اپنی خواہشات کو پورا کرتا ہے۔ ساتھ ہی دوسرے لوگوں کی مدد کرکے اس بات کا ثبوت دیتا ہے کہ اس کی انفرادی، خیر، عالمگیر خیر (اور جسے گرین خیر مشترک کے نام سے پکارتا ہے) کا حصہ ہے۔

برفو اس ضمن میں اپنا مؤقف پیش کرتا ہے کہ:

انسانی فکر کو فطرت کی طرف سے عائد کردہ مشکلات وموانع کے خلاف جنگ نہیں کرنا پڑی۔ اگر کبھی ایسا اتفاق ہوا ہے بھی تو انسانی فکر نے اس کا حل نکال کر کامیابی حاصل کر لی ہے۔ اس کی حقیقی جنگ تو اس کے خود ساختہ موانع کے خلاف رہتی ہے۔ انہی غیر فطری اور مصنوعی موانع نے اس کی تمام تخلیقی قوتوں کو مفلوج کر دیا ہے۔ یہ خود ساختہ غیر فطری موانع وہی ہیں جنھیں ہر انسان نے اپنے آپ کو نوع انسانی سے الگ جداگانہ ہستی تصور کرکے، انسان اور انسان کے درمیان حائل کر رکھا ہے۔

اب انسانی فکر کا رجحان بھی اسی طرف مبذول ہو رہا ہے کہ دنیا کی فلاح وبہبود کا راز وحدت معاشرہ پر مبنی حکومت میں

ہے۔یعنی ساری دنیا کو ایک مرکز کے تابع لے آنے کا۔جب ساری دنیا پر ایک ہی قانون خیر مشترک اور ایک ہی معاشرہ ہوگا تو تضادات اور نزاعات یعنی شر کا خود بخود خاتمہ ہو جائے گا۔

ذات کی نشوونماء کرتے ہوئے حصولِ کمال معاشرہ کے اندر رہ کر ہی مُمکن ہے۔لہٰذا اگر کوئی شخص اپنی انا کی تکمیل چاہے تو وہ معاشرے ہی کو تکمیل انا (خودی) کا ذریعہ سمجھے۔وہ معاشرے کا زیر بار احسان ہے کہ وہ اس کا حق کسی طرح ادا کر ہی نہیں سکتا۔بجز اس کے کہ وہ معاشرے کی بھلائی چاہے،یعنی اپنے آپ کو ''خیر مشترک'' سے وابستہ کر کے بھی وہ معاشرے کا حق ادا کر سکتا ہے۔

راشڈل نے بھی اس کی وضاحت میں لکھا ہے کہ:

''یہ معاشرہ ایسی کیفیت کا نام ہے جس میں ہر فرد معاشرہ کی بہبود کے لیے وہی کچھ کرے جو معاشرہ فرد کی بہبود کے لیے کرتا ہے۔''

حُکمائے مغرب کی انسانی ذات کی نشوونما سے تکمیل کے حصول کی نظریہ وجودیت سے وضاحت:

حُکمائے مغرب ہی کے تصور کے نظریہ وجودیت میں اختیارِ ذاتی کو مختلف نوعیتیں سے سمجھا اور سمجھایا جاتا ہے۔اِس کا قدرے تفصیل سے تجزیہ لینا مُفید رہے گا وجودی فلسفہ کا موضوع انسان ہے۔انسان کا ایک تو معروضی مطالعہ ہوتا ہے جسے نفسیات،معاشیات وغیرہ کرتی ہے۔اس میں انسان معروضی مطالعہ کرتا ہے۔دوسرا انسان کا مطالعہ موضوعی ہوتا ہے اور وجودی اس دوسری قسم کے مطالعہ سے سروکار رکھتے ہیں۔

موضوعیت سے یہ مراد نہیں کہ انسان اپنے آپ میں مقید ہے۔اس میں انسان کو آزاد،خود تخلیقی اور بلند منازل طے کرنے کا حامل سمجھا جاتا ہے۔خود تخلیقی سے بھی یہ مراد نہیں کہ انسان خود کو ان معنوں میں تخلیق کرتا ہے جن معنوں میں خدا انسان کو تخلیق کرتا ہے۔انسان اپنے آپ کو تخلیق کرتا ہے صرف ان معنوں میں کہ جو کچھ وہ بنتا ہے وہ اپنے ہاتھوں بنتا ہے اور اپنی آزادی استعمال کرتے ہوئے وہ ماضی کے بندھن توڑ کر بلندی کی طرف بڑھ سکتا ہے۔

وجودی فلسفہ انسان کا تجزیہ،معروضی/ سائنسی نقطہ نگاہ سے نہیں کرتا بلکہ اس کا مقصد انسانی آزادی کو اجاگر کرنا ہوتا ہے تاکہ حقیقی انتخاب کی گنجائش پیدا ہو۔حقیقی انتخاب کی صلاحیت حاصل کرنا خود انسان کی اپنی ذات پر منحصر ہوتا ہے۔

موضوعی مطالعہ کے تناظر میں وجودی فلسفہ کا مفکر مارسل کہتا ہے کہ میں کائنات میں صرف جسم سے شرکت نہیں کرتا۔انسان ہونے کی وجہ سے میرا رشتہ دوسرے اشخاص سے ہے یہ رشتہ دو قسم کا ہو سکتا ہے۔

ایک رشتہ میں دوسروں کو صرف بطور شے لیا جاتا ہے۔ان کو استعمال کیا جاتا ہے یا ان کا استحصال کیا جاتا ہے۔اس کی مثال دیتے ہوئے وہ کہتا ہے اگر محبت صرف تسکین ہوس کے لیے ہو تو دوسرا شخص جسے ہوس پرستی کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے وہ صرف شے ہو جاتا ہے۔انسان نہیں رہتا۔

ایک دوسرا رشتہ (من وتو) کا ہے،جس میں دوسرا شخص انسان سمجھا جاتا ہے بعینہ ویسا جیسا میں خود ہوں۔یہ رشتہ موضوعی

ہے اس میں خودغرضی یا ہوس پرستی کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ یہ انسانی رشتہ ہوتا ہے، دو انسانوں کے درمیان۔ یہ رشتہ محبت، وفاداری اور ایک دوسرے کے کام آنے کا ہوسکتا ہے۔ یہ رشتہ دوسری سوچ پر ابھرتا ہے۔ اس سطح پر مَیں ہیئت میں ذاتی آزادیٔ ارادہ سے موضوعی رابطہ سے شرکت کرتا ہوں۔

نظریہ وجودیت کے مطابق افراد اپنی ذات کو آزاد اور امکانات کا مجموعہ سمجھ کر اس فکر میں رہتے ہیں کہ امکانات کو حقیقت میں تبدیل کریں اور جو صلاحتیں ان کی ذات میں مضمر ہیں انھیں پایہ تکمیل تک پہنچائیں۔ لہٰذا افراد کی اخلاقی زندگی میں افعال کی حیثیت بہت نمایاں ہوتی ہے۔ لیکن ان افعال کا تعلق ماحول سے نہیں بلکہ وجود کی تکمیل کے ساتھ ہوتا ہے۔

اس نظریہ کی وضاحت میں وہ کہتے ہیں کہ میرے متعلق کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ''میں یہ ہوں'' کیونکہ میں اپنی ہیئت کا امکان ہوں۔ میں مکمل نہیں اور میں تو ہر لحظہ اپنی تخلیق کرتا رہتا ہوں اور انتخاب کے ذریعے تحصیل ذات میں لگا رہتا ہوں۔ اس کا علم ذاتی تجربہ سے ہوسکتا ہے۔ آزادی البتہ سائنس کی گرفت میں نہیں آتی۔ اسے ثابت یا رد نہیں کیا جاسکتا۔ اس کا تجربہ انتخاب کے موقعہ پر ہوتا ہے جس میں پوری ذمہ داری سے کوئی متبادل چن کر اپنی تخلیق کرتا ہوں۔ ایک وجودی فلسفی دوسروں کی توجہ تو اپنی طرف مبذول کرا سکتا ہے لیکن جس سچائی پر انسان پہنچتا ہے وہ اس کی اپنی سچائی ہے جسے اس نے ذاتی انتخاب اور مستقل عزم سے حاصل کیا ہوتا ہے۔

نظریہ وجودیت کا موقف:

نظریہ وجودیت کی وضاحت میں کیرکیگارڈ ایک وجودی سفر متعارف کراتا ہے، جس میں انسان ایک منزل سے دوسری منزل کی طرف بغیر کسی جبر کے خود انتخاب سے آگے بڑھتا ہے۔

اس وجودی سفر میں پہلی منزل وہ تحساتی منزل گنواتا ہے۔ اس منزل پر کوئی اخلاقی اصول یا ضابطہ نہیں ہوتا۔ اس منزل میں وہ لوگ ہوتے ہیں جو اصولوں سے سخت نفرت کرتے ہیں اور ہر قسم کا عیش چاہتے ہیں۔ یہ لوگ انتخاب اور عزم سے عاری ہوتے ہیں اور جانوروں کی زندگی گزارتے ہیں۔

دوسری منزل اخلاقی منزل ہے۔ اس میں انسان اپنے آپ کو کسی عالمگیر اور حتمی اخلاقی اصول کے تحت لے آتا ہے اور اپنے آپ کو خود اپنے انتخاب سے اخلاقی اصول کا پابند بنا لیتا ہے۔ لیکن کیرکیگارڈ کے مطابق اخلاق کا مقصد انسان کو عارضی خوشی دینا ہے۔

لہٰذا تیسری منزل آتی ہے جو مذہبی کہلاتی ہے۔ اس منزل پر انسان اخلاقی اصولوں کا پابند نہیں ہوتا بلکہ خدائے برتر سے رابطہ پیدا کر کے اس سے رشتہ قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے اور کامیاب ہونے کی صورت میں صحیح معنوں میں فرد بنتا ہے۔

وجودی ارتقاء ہیگل کے فکری ارتقاء سے مختلف ہے۔ فکری ارتقاء میں ایک لزومت ہے ایک ترکیب سے دوسری ترکیب جنم لیتی ہے اور اس کی تہہ میں منطقی لزومت کام کرتی ہے۔ وجودی ارتقا میں کوئی جبر نہیں۔ یہاں یہ ضروری نہیں کہ ارتقاء ایک

ہی طرح سے ہو یا ایک منزل کے بعد دوسری منزل آئے۔ ہر منزل انسان کو خود انتخاب کرنی پڑتی ہے لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ وجودی ارتقا کی تہہ میں کوئی حکمت نہیں۔ وجودی ارتقا سے واضح ہو جاتا ہے کہ زندہ رہنا سانس لینے کا نام نہیں ب لکہ اس کا مطلب خود کا انتخاب کرنا ہے۔ وجود امکانات کا مجموعہ ہے ان کو واقعیت میں لاکر ہی صحیح معنوں میں اِنسان بنتا ہے۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان کیا ہے اور صحیح معنوں میں انسان بننے سے کیا مراد ہے۔

نظریۂ وجودیت میں یہاں وجودی دو جماعتوں میں بٹ جاتے ہیں۔

(1) الٰہیاتی وجودیت اور؛

(2) غیر الٰہیاتی وجودیت

الٰہیاتی وجودیت کا عام طور پر نظریہ یہ ہے کہ انسان اس وقت صحیح معنوں میں انسان بنتا ہے جب اس کا رشتہ ماورائی ہستی سے بندھ جاتا ہے۔ مارسل کے مطابق انسان اپنی آزادی اور شعوری حالت میں یہ رشتہ قائم کر کے انسانیت کی معراج پر پہنچ جاتا ہے۔ اس میں ارادے کی آزادی قانون کی تابعداری میں نصیب ہوتی ہے۔ یہ قانون خود بھی روح مطلق کا مظہر ہوتا ہے اور یونہی اسے اختیار نہیں کیا جاتا۔

وجودی کہتے ہیں کہ خدا کے لیے کوئی ثبوت نہیں دیا جا سکتا۔ ہر آدمی خدا کو دریافت کرتا ہے ان تجربات کی تلاش کرنے پر جو انسان کو انسان بناتے ہیں۔ یہ تجربات خدا کی ''دریافت'' میں مدد کرتے ہیں۔

غیر الٰہیاتی وجودیت کے حامل بعض حکماء کا خیال ہے کہ نہ تو خدا کے ساتھ رشتہ جوڑنے کی ضرورت ہے نہ ابدی اقدار کو ماننے کی اور نہ ہی عالمگیر اخلاقی اصولوں کی پیروی کرنے کی۔ انسان کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہیے۔ زندگی کو پوری طرح اپنے ہاتھوں میں لینا چاہیے۔ کوئی ماضی نہیں جو اس کی آزادی کو پابند کر سکے نہ ہی کوئی مستقبل ہے جو اس کے پاؤں میں زنجیریں ڈال دے۔ انسان خود اپنا ماضی اور مستقبل اپنے ارادوں، انتخابات اور طرز حیات سے بناتا ہے۔

نظریہ وجودیت میں انسانی ذات کے حصول کا سفر:

اس موقعہ پر کیرکیگارڈ ایک وجودی سفر متعارف کراتا ہے، جس میں انسان ایک منزل سے دوسری منزل کی طرف بغیر کسی جبر کے خود انتخاب سے آگے بڑھتا ہے۔

اس وجودی سفر میں پہلی منزل وہ تحسساتی منزل گنواتا ہے۔ اس منزل پر کوئی اخلاقی اصول یا ضابطہ نہیں ہوتا۔ اس منزل میں وہ لوگ ہوتے ہیں جو اصولوں سے سخت نفرت کرتے ہیں اور ہر قسم کا عیش چاہتے ہیں۔ یہ لوگ انتخاب اور عزم سے عاری ہوتے ہیں اور جانوروں کی زندگی گزارتے ہیں۔

دوسری منزل اخلاقی منزل ہے۔ اس میں انسان اپنے آپ کو کسی عالمگیر اور حتمی اخلاقی اصول کے تحت لے آتا ہے اور اپنے آپ کو خود اپنے انتخاب سے اخلاقی اصول کا پابند بنا لیتا ہے۔ لیکن کیرکیگارڈ کے مطابق اخلاق کا مقصد انسان کو

عارضی خوشی دینا ہے۔

لہٰذا تیسری منزل آتی ہے جو مذہبی کہلاتی ہے۔ اس منزل پر انسان اخلاقی اصولوں کا پابند نہیں ہوتا بلکہ خدائے برتر سے رابطہ پیدا کر کے اس سے رشتہ قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے اور کامیاب ہونے کی صورت میں صحیح معنوں میں فرد بنتا ہے۔

وجودی ارتقاء ہیگل کے فکری ارتقاء سے مختلف ہے۔ فکری ارتقاء میں ایک لزومت ہے ایک ترکیب سے دوسری ترکیب جنم لیتی ہے اور اس کی تہہ میں منطقی لزومت کام کرتی ہے۔ وجودی ارتقا میں کوئی جبر نہیں۔ یہاں یہ ضروری نہیں کہ ارتقاء ایک ہی طرح سے ہو یا ایک منزل کے بعد دوسری منزل آئے۔ ہر منزل انسان کو خود انتخاب کرنی پڑتی ہے لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ وجودی ارتقا کی تہہ میں کوئی حکمت نہیں۔ وجودی ارتقا سے واضح ہو جاتا ہے کہ زندہ رہنا سانس لینے کا نام نہیں بلکہ اس کا مطلب خود کا انتخاب کرنا ہے۔ وجود امکانات (potentiality) کا مجموعہ ہے ان کو واقعیت (Actuality) میں لا کر ہی صحیح معنوں میں انسان Authentic بنتا ہے۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان کیا ہے اور صحیح معنوں میں انسان بننے سے کیا مراد ہے۔

نظریۂ وجودیت میں یہاں وجودی دو جماعتوں میں بٹ جاتے ہیں۔

(1) الٰہیاتی وجودیت اور:

(2) غیر الٰہیاتی وجودیت

الٰہیاتی وجودیت کا عام طور پر نظریہ یہ ہے کہ انسان اس وقت صحیح معنوں میں انسان بنتا ہے جب اس کا رشتہ ماورائی ہستی سے بندھ جاتا ہے۔ مارسل کے مطابق انسان اپنی آزادی اور شعوری حالت میں یہ رشتہ قائم کر کے انسانیت کی معراج پر پہنچ جاتا ہے۔ اس میں ارادے کی آزادی قانون کی تابعداری میں نصیب ہوتی ہے۔ یہ قانون خود بھی روح مطلق کا مظہر ہوتا ہے اور یونہی اسے اختیار نہیں کیا جاتا۔

وجودی کہتے ہیں کہ خدا کے لیے کوئی ثبوت نہیں دیا جا سکتا۔ ہر آدمی خدا کو دریافت کرتا ہے ان تجربات کی تلاش کرنے پر جو انسان کو انسان بناتے ہیں۔ یہ تجربات خدا کی ''دریافت'' میں مدد کرتے ہیں۔

غیر الٰہیاتی وجودیت کے حامل بعض حکماء کا خیال ہے کہ نہ تو خدا کے ساتھ رشتہ جوڑنے کی ضرورت ہے نہ ابدی اقدار کو ماننے کی اور نہ ہی عالمگیر اخلاقی اصولوں کی پیروی کرنے کی۔ انسان کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہیے۔ زندگی کو پوری طرح اپنے ہاتھوں میں لینا چاہیے۔ کوئی ماضی نہیں جو اس کی آزادی کو پابند کر سکے نہ ہی کوئی مستقبل ہے جو اس کے پاؤں میں زنجیریں ڈال دے۔ انسان خود اپنا ماضی اور مستقبل اپنے ارادوں، انتخابات اور طرز حیات سے بناتا ہے۔

جرمنی کے ایمونیئل کانٹ کا فلسفہ ایتھکس میں بہت بڑا مقام رکھتا ہے۔ اُنہوں نے انسانی تخلیقی اعمال کا مُحرک ہی اپنی اصطلاح میں خیرِ محض یعنی ذات کی نشوونما کا مقصد بتایا ہے۔

دیکھا جائے تو ذات کی نشوونما کے موضوع پر متعدد حکماء کی تحریریں دستیاب ہیں، لیکن طوالت سے بچاؤ کے لئے ہم نے اِن کی نمائندگی کے لئے نہایت اہم مُفکر ایموئیل کانٹ کا مؤقف بیان کرنے کے لئے انتخاب کیا ہے۔

کانٹ کا ذات کی نشوونماء کے تصور میں خیرِ محض ارادہ کا نظریہ:

کانٹ کا نظریہ مختصر الفاظ اس کا زبان زدِ عام خیرِ محض کے ارادہ کا مقولہ ہے، جس کے گرد اس کی بحث گھومتی ہے۔ اس دنیا میں بلکہ اس دنیا سے باہر بھی کوئی چیز ایسی نہیں ہے جسے بلا مشروط خیرِ محض کہا جا سکے سوائے ذات کی نشوونماء کے اصول ارادہِ خیرِ محض کے۔ اس کی ساری غایت اس اصول اور بنیاد پر استوار ہے۔ کانٹ کے نزدیک نہ تو اعمال کے خیر وشر ہونے کا معیار اس کے نتائج ہیں (اس لیے وہ افادی نظریہ اخلاقیات کا بطلان کرتا ہے اور نہ ہی اس کے خیال میں دنیا کے حیات کی عقلی تجارب خیر وشر کے متعلق کوئی یقینی معلومات بہم پہنچا سکتے ہیں۔ خیرِ محض فقط ''نیک ارادہ'' کا نام ہے۔

اس مسئلہ کے دو ٹکڑے ہیں ایک ارادہ اور دوسرا خیرِ محض۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ ارادہ کسے کہتے ہیں اور نیک کسے کہتے ہیں؟ ارادہ کے متعلق کانٹ کہتا ہے کہ یہ درحقیقت قویٰ حیات میں سے ایک قوتِ محرک کا نام ہے اور یہ قوت انسان میں ایک حرکت پیدا کرتی ہے اور اِسی سے ارادی اعمال کا صدور ہوتا ہے۔

تمام ملکات وقوائے انسانی اپنے مقاصد سے بے خبر سوئے ہوئے ہوتے ہیں اور ارادہ ہی ان کو بیدار کرتا ہے۔ چنانچہ ایک صناع کی مہارت، مفکر کی قوت عمل اور ذہانت ان تمام کا حیات انسانی پر اس وقت تک مطلق کوئی اثر نہیں ہوتا جب تک قوت ارادی ان مقاصد کو حرکت میں نہ لائے اور یہ سب اس وقت تک بے کار ہیں جب تک کہ ارادہ ان کو عمل کی شکل وصورت نہ پہنائے۔ یہ بات تو اخلاقیات کے مسلمات میں شامل ہے کہ اخلاقی حکم، یعنی عمل پر خیر وشر ہونے کے متعلق فیصلہ صرف ارادی اعمال پر ہی صادر ہوسکتا ہے اور جب تک ارادہ نہ پایا جائے یہ حکم بھی نہیں پایا جا سکتا۔ ارادہ میں نیت کا اطلاق صرف انہی اعمال پر کر سکتے ہیں جو کہ یقینی طور پر ارادی ہوں۔

اخلاقی قانون نظری طبیعی قانون سے بالکل مختلف ہے۔ اخلاقی قانون، طبیعی قانون کے برعکس پابندی کا مطالبہ کرتا ہے مجبور نہیں۔ لہٰذا اس ضمن میں اختیار بھی پایا جاتا ہے۔ گو اختیار کو نظری طور پر ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ارادے کو اس میں قطعاً شک نہیں۔ یہاں ہمارے لیے بحث طلب امر یہ بھی ہے کہ اعمال پر خیر وشر کا جو حکم صادر ہوتا ہے وہ اعمال سے پیدا شدہ نتائج کے لحاظ سے ہوتا ہے یا عامل کی اس غرض وغایت کے اعتبار سے جس کی وجہ سے یہ عمل وقوع پذیر ہوا ہے؟ اس لیے بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ انسان ایک کام کو بھلائی کی غرض سے کرتا ہے لیکن نتیجتاً اس سے ایسی برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں جس کا اس کو گمان بھی نہیں ہوتا۔ اس بارے میں عقل انسانی کے تقاضے کے عین مطابق حق یہ ہے کہ کسی کام پر خیر وشر کا حکم صادر کرنے کے لیے عامل کی غرض ہی کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ بس اگر عامل کی نیت اس کام میں خیر کی ہے تو نتیجہ خواہ کچھ بھی ہو وہ کام عامل کا خیر ہی کہلائے گا۔ لہٰذا اخلاقی حکم لگانے سے پہلے عامل کے غرض وارادہ کو دیکھنا ضروری ہے

اس لیے ہمیں اپنی ذات کے علاوہ دوسروں کے عمل پر اس وقت تک حکم نہیں لگانا چاہیے جب تک کہ تحقیق و تفتیش سے اس کے عامل کی غرض یا ارادہ و نیت کے بارے میں معلوم نہ ہو جائے۔

ارادی افعال کی اقسام:

ارادی افعال کو مندرجہ ذیل دو اقسام میں بھی تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(1) افعال بر بنائے جذبہ:

(2) افعال بر بنائے اصول:

پہلے افعال بر بنائے جذبہ میں وہ اعمال شامل ہیں جو ذاتی پسند یا ناپسند پر سرانجام دیے جاتے ہیں جو ہمارے اِس باب کا موضوع نہیں بنتے کیونکہ وہ عقلی یا فکری اعمال نہیں ہوتے جو انسانی ذات کی نشوونما کا حصہ کہلانے کے حق دار ہوں۔

افعال بر بنائے اصول، یہ افعال بر بنائے جذبہ کے برخلاف ایک واضع اور عمومی اصول پر مبنی ہوتے ہیں کانٹ کا کہنا یہ ہے کہ کوئی فعل اخلاقی طور پر صائب اور راست نہیں ہوسکتا، جب تک کہ وہ کسی عمومی اصول کے تحت انجام نہ دیا گیا ہو، اور یہ عمومی اصول فاعل کو شعوری طور پر قبول نہ ہو۔ اسے حکم مطلق بھی کہتے ہیں اور حکم مطلق دراصل وہ ہے جو اپنے ذاتی محاسن کی بنا پر قبول کیا گیا ہو۔ کسی خارجی مقصد کے حصول کے لیے ایک ضابطے کے طور پر نہیں بلکہ اپنے تئیں مقصود ذات کی نشوونما ہو۔

اگر کوئی عمل ایک ایسے اصول پر مبنی ہے جو حکم مطلق ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ عمل برائے اصول یا بر بنائے فرض ہے۔

کائنات میں ہر شے قانون کے تابع سرگرم عمل ہے لیکن یہ خصوصیت صرف انسان (صاحب عقل) کو حاصل ہے کہ وہ قوانین کے تصورات کے مطابق عمل کرتا ہے، یعنی اصولوں کے مطابق۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان صاحبِ ارادہ ہے لیکن چونکہ اصولوں سے اعمال کا مستنبط کرنا عقل کا کام ہے۔ اس لیے کانٹ کے نزدیک ارادہ عملی عقل کا دوسرا نام ہے۔ یعنی کانٹ کے نزدیک عملی عقل ہی انسانی ارادہ کا دوسرا نام ہے۔ جب انسان کسی کام کا ارادہ کرتا ہے تو وہ گویا اپنی عملی عقل کے فیصلے کو بروئے کار لانے کا عزم کرتا ہے۔

کانٹ کا نیک ارادہ (Good Will):

کانٹ کے نزدیک ارادہ کے معنی ہیں وہ قوت جس کی رو سے انسان کسی قانون کے تصور (اصول) کے مطابق کام کرنے کا تہیہ کرے۔ یعنی ایسے اعمال جو انسان کی اپنی جبلت کے تحت جذبات پر مبنی نہ ہوں بلکہ کسی عمومی اصول کے تحت انجام پائیں اور یہ اصول بھی فاعل کو شعوری طور پر قبول ہو۔ کانٹ نے خود نیک ارادہ کی یوں تعریف کی ہے۔

''مستقل مزاجی کے ساتھ مسلسل اور داخلی کشمکش اور تصادم کے بغیر، وہ ارادہ جو کسی کام کو صرف اس لیے کرتا ہے کہ اس کا کرنا فرض ہے، نیک ارادہ ہے۔''

یعنی ہر قسم کے افادی تصور سے بے نیاز ہو کر فرض کو محض فرض سمجھ کر ادا کرنا نیک ارادہ ہے۔ کانٹ کہتا ہے کہ جس عمل میں

(خواہ وہ کتنا ہی نیک کیوں نہ ہو) ذرا برابر بھی صلہ کی امید یا معاوضہ کا تصور شامل ہو جائے وہ عمل فرض میں نہیں رہتا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ اِس ضِمن میں ہمارا بھی عقیدہ ہے کہ قرآن کریم نے جس کام کا حکم دیا ہے وہ فرض ہے، اور جس سے روک دیا ہے، وہ ممنوع ہے۔ قرآن میں ہے کہ قرآنی قوانین کی پابندی ہمیں بطور فرض ادا کرنے کا حکم ہے۔

اِنَّ الَّذِیۡ فَرَضَ عَلَیۡکَ الۡقُرۡاٰنَ (28:85)

''بے شک وہ ذات جس نے تجھ پر قرآن کریم کو فرض قرار دیا ہے''۔

لہٰذا یہاں قرآن اور کانٹ کے نزدیک عمل خیر کی قیمت کا حصول فرض کی ادائیگی میں مُضمِر وہ اصول ہوتا ہے جس کے مطابق وہ عمل ظہور میں آتا ہے۔

اس نظریہ کے ماتحت ''کانٹ کے نزدیک'' اصول بھی دو قسم کے ہیں۔

ایک وہ جو انسان کو کسی مقصد کے حصول کے پیش نظر آمادہ عمل کریں۔ انھیں کانٹ مادی اصول کہتا ہے۔

دوسرے وہ جو کسی مقصد کے تصور کے بغیر آمادہ عمل کریں، ان کا نام غیر استدلالی اصول ہے اس کے نزدیک ''احساس فرض'' اس دوسری قسم کا اصول فراہم کرتا ہے۔

اس اصول کو وہ اصول مطلق یا امر غیر مشروط کہتا ہے کانٹ کا نظریہ اس کی ''امر غیر مشروط'' کی توضیح وتفسیر ہے۔ جس کی نوعیت کا استخراج کانٹ نے قانون کے ادراک سے کیا ہے۔

اس کے نزدیک امر غیر مشروط سے مفہوم یہ ہے کہ اس سے ایسا کام ظہور میں آئے جس سے کسی مقصد کا حصول مقصود نہ ہو بلکہ وہ کام اپنی ذات میں فرض یعنی واجب العمل ہو۔ کوئی فعل اس لیے اچھا نہیں ہوتا کہ اس کے نتائج اچھے ہوتے ہیں یا وہ دانشمندانہ ہوتا ہے بلکہ اس کا اچھا ہونا اس لیے مسلم ہے کہ ادائے فرض کی جو باطنی حس ہم میں موجود ہے وہ اپنی تعمیل کا تقاضہ کرتی ہے اور ہر اچھا فعل ایسے ہی حکم کی تعمیل ہوتا ہے۔

اس دنیا میں صرف ایک چیز ہے جو غیر مشروط طور پر اچھی ہے۔ وہ ارادہِ خیرِ محض ہے۔ یعنی یہ عزم کہ ہم ذاتی مفاد اور نقصان سے بے نیاز ہو کر اخلاقی قانون کی پیروی کریں گے۔

کانٹ نے اسی اصول مطلق یا امر غیر مشروط کو ذات کی نشوونماء کے عمل میں نیک ارادہ سے وابستہ کرتے ہوئے کچھ اصولوں کی نشاندہی کی ہے۔ جن کو کانٹ کے اصول اخلاقیات کا نام دیا جاتا ہے۔ وہ تعداد میں تین ہیں۔

کانٹ کے تین مشہور اخلاقی قوانین:

کانٹ کا پہلا اصول یہ ہے کہ:

1۔ Act on a principle to become a universal law

اس طرح عمل کر گویا تیرے عمل کا قانون تیری ہی مرضی سے عالمگیر قانون بن جائے۔

یعنی اصول عمل ایسا ہونا چاہیے جس کے بارے میں کوئی بھی ذی عقل انسان متوافق طور پر ارادہ کر سکے کہ اس پر تمام دوسرے انسان عمل کر سکتے ہیں اور ایسا کرنا فرض ہے۔

یہ اصول ایک آفاقی حکم ہے جو اخلاقی طور پر ہر شخص کو اپنا پابند/ مکلف بناتا ہے۔ اِس میں جو اصول کسی ایک فرد کے لیے درست قرار دیا ہے وہی اصول پوری بنی نوعِ انسان کے لیے بھی درست قرار دیا جائے گا۔

کانٹ چونکہ سوائے نیک ارادہ کے اور کسی چیز کو فی الذات خیر نہیں مانتا، لہذا اِس اصول سے مراد ایسے ارادے سے ہے جو نیکی پیدا کرنے پر تلا ہوا ہو، نہ کہ ایسا ارادہ جو ذہن میں پرورش پاتا رہے اور خارجی ماحول سے گھبرائے۔ اس اصول کے تحت اخلاقی زندگی میں استثناء کسی حالت میں بھی جائز نہیں کیونکہ استثناء تضاد کو ظاہر کرتا ہے اور تضاد نقص پر دلالت کرتا ہے۔ یہاں استثناء کی گنجائش نہ رکھنا، وضاحت طلب ہے اور اس کی مختصر سی تشریح ضروری ہے۔

فرض کریں آپ ڈرائیو کر رہے ہیں کہ اشارے پر سرخ بتی روشن ہو جاتی ہے۔ اصولی طور پر آپ کو رک جانا چاہیے مگر آپ کو جلدی ہے تو اس وقت آپ کو کیا کرنا چاہیے؟ اگر آپ اشارہ توڑ کر گزر جاتے ہیں، تو درحقیقت آپ اس بات کے متمنی ہیں کہ یہ اصول بن جانا چاہیے، جس کی نوعیت عالمگیر قانون کی سی ہو کہ ''ایمرجنسی میں اشارہ توڑنا عین عملِ خیر ہے۔'' فرض کریں اس طرح کے دو حضرات کو آپ کے علاوہ ایمرجنسی لاحق ہوگئی ہو، تو اس چوک میں جہاں آپ اشارہ توڑ رہے ہیں کیا ہوگا؟ ظاہر ہے کہ اس نیک ارادے کا نتیجہ بدترین حادثہ ہی ہو سکتا ہے۔

کانٹ کا دوسرا اصول یہ ہے:

Never treat Humanity as means but as an end_2

ہر انسان کی ذات کو فی نفسہ ایک غایت سمجھو اور کسی کو محض ایک ذریعہ نہ سمجھ۔

کانٹ کا دوسرا اصول بھی پہلے اصول کا حصہ ہے۔ ہر انسان کی ذات اپنی جگہ وہی اہمیت رکھتی ہے جو کسی دوسرے انسان کی لیکن ہم عام زندگی میں دوسرے کو ذریعہ بنا کر اپنا مقصد حاصل کرتے ہیں۔

یہ اصول معاشرتی زندگی میں ضروری ہو جاتا ہے، چونکہ ہر شخص کا دوسرے شخص سے تعلق ہے اس لیے ایک دوسرے کے کام آتا ہے۔ جیسے مزدور مالک کے لیے کام کرتا ہے، کسان دوسروں کے لیے اناج اگاتا ہے اور استاد طلبہ کو پڑھاتا ہے۔ ان سب تعلقات کے بغیر معاشرے کا تصور ہی نہیں ہو سکتا۔ کانٹ نے جس بات پر زور دیا ہے وہ یہی ہے کہ ہمیں دوسروں کو محض ذریعے کے طور پر استعمال نہیں کرنا چاہیے بلکہ یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے کہ وہ لوگ خود غایتیں ہیں اور ہمارے لیے جو خدمات انجام دے رہے ہیں ان سے قطع نظر بذات خود قابل قدر ہیں۔ اخلاقی غلطی صرف اس وقت سرزد ہوتی ہے جب ہم دوسروں کی عزت کو مجروح کرتے ہوئے بطور ذریعہ استعمال کریں۔ لہٰذا کانٹ کا مفہوم کچھ اس طرح لینا ہوگا کہ ہم دوسروں کی یا دوسرے ہماری خدمات مجبوراً اور بلا اجازت نہ لیں۔

Surah *Muhammad* (محمّد) – Durus-al-Qur'an: Chapter 1

By G. A. Parwez (Episode No.2)
(Translated by: Mansoor Alam)

The Quran uses logic and proof (not sword) to convince humans of the veracity of it claims

Now let us analyze the familiar rhetoric that "Islam spread by sword." To start with let us ask the question: who used the sword for the very first time? The answer: The Quraysh, who wanted to wipe out the Prophet (PBUH) and his companions? The Prophet (PBUH) and his small band of companions had to leave Mecca and took shelter as refugees in Medina – a faraway place considering the means of communication those days. But what did the Quraysh do to them? Fully armed, they launched one military attack after another to wipe out Islam and Muslims. I do not want to go into the concept of Jihad in Islam as we have covered that many time before. But I want to make it absolutely clear that Islam did not spread by the sword nor could it ever expand by the sword. If anyone says that "Islam spread by sword," then it goes against the clear guidance and order of the Quran.

The Quran says that one's Iman (belief in Islam) must be based on knowledge and wisdom; that it must be based on intellect and thought; that it must be based on logic and proof; and that it must satisfy one's heart and mind. After all this if one believes that the Quran's realities are indeed true, then only this will be called Iman according to the Quran. Otherwise not. Well then, it is clear that this kind of Iman cannot happen even by coercion, let alone by the force of sword. The Quran goes so far as to say that if one willingly, but blindly believes it, then it would not be considered Iman. So, the rhetoric "Islam spread by sword" is nothing but propaganda and false pronouncement against Islam.

Prophet's life in Mecca and then as refugee in Medina

The Prophet (PBUH) lived for 13 years in Mecca. The Quraysh didn't let him have a single day of peace during all these 13 years. Some people had to take shelter in Abyssinia; some others in other places. Those in

Mecca were subjected to extreme suffering and even torture. While all this was happening the Prophet (PBUH) was busy in laying down the foundation of an organizational structure for his divine program. He was busy in educating and training his companions. He was busy fortifying their character and purifying their hearts. He was building this group with exemplary character so that they will stand out as shining stars in the world. This was the group that was to lay the foundation of the Islamic system. The question then arose as to which place was suitable for implementing this system. The people of Medina who had become Muslims stepped forward and offered their help and support to the Prophet (PBUH) to come to Medina and to establish the divine system.

Quraysh's war against Prophet (PBUH) even after migration to Medina

So, the Prophet (PBUH) and his companions left Mecca for Medina as refugees; and started the process for establishing the divine program. Quraysh knew that the system that Prophet (PBUH) was inviting people to, if it ever gets established anywhere then their tripartite system – of Autocracy, Priesthood, and Capitalism – cannot last.

The distance between Mecca and Medina is around three hundred miles. The only way to travel those days was by foot or camel that was several days journey. The Prophet (PBUH) and his companions were busy establishing their program in Medina, saying nothing to Quraysh. But the Quraysh did not leave them alone in Medina either. In year 2 A.H. they travelled to Medina with a large army of more than 2000 men with full military preparation to attack Medina. Our Prophet (PBUH) and companions were around 300 people, a group of refugees totally unprepared for such a large scale attack by the Quraysh. Muslim community of Medina weren't used to warfare either; and they did not have their own state. So, they could not mobilize their own army to fight the Quraysh. Under the situation there were only two choices before the Muslims: 1) Surrendering to Quraysh and accepting all their demands. But then, under the customs of those days, this meant being enslaved or killed by Quraysh; or 2) Come outside of Medina and fight the much larger and fully equipped army of Quraysh and die while fighting. So, the Muslims came out of Medina to the place called Badra and faced the army of Quraysh. They fought Quraush with unwavering conviction in Allah and with steadfast determination and great fortitude. The mighty

Quraysh were defeated.

The continuous war waged by Quraysh for seven years after the battle of Badr

My dear friends, what does all this show? Did Islam spread by sword? After the Quraysh were defeated at the battle of Badr, did the Prophet (PBUH) and his companions chase them back to Mecca to punish them for their aggressive behavior? The Quraysh were very vulnerable and weak after their defeat at Badr and any other adversary would have taken full advantage of the situation and chased Quraysh back to Mecca and would have finished them once and for all. This would have been perfectly justified according to rules of war. But the Prophet (PBUH) didn't do that. On the other hand, the Quraysh kept attacking the Prophet (PBUH) and his companions every year – even up to three times a year – until 7th A.H. They even started inviting other tribes to join in this fight against the Prophet (PBUH). The Prophet (PBUH) and companions had no choice but to fight these enemies – to sacrifice themselves to protect Islam. We can see that there is no question that Islam spread by the sword. In fact, it was the other way around. Enemies of Islam wanted to wipe out Islam by the sword. And Muslims had no choice but to defend Islam. History shows that early Muslims always fought a defensive war when attacked. And everyone has the right to defend oneself. The Quran gave permission to Muslims to defend themselves with full might. أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا (22:39) – It is for this reason that permission is hereby given to the people (Momineen) who have been very oppressed and against whom war is being wrongfully waged, to fight (in self-defense). What was their crime that they were being attacked? الَّذِينَ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيرًا وَلَيَنصُرَنَّ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ (22:40) – The only fault of the oppressed people who were unjustifiably driven from their homes was that they proclaimed Allah alone as their Sustainer. But evil rebellious forces never easily permit that. Imagine, if Allah had not enabled people to defend themselves against others and let loose the rebellious forces to do whatever they liked, then they would have not even spared places of worship like monasteries, churches, synagogues and mosques, where Allah's name is proclaimed profusely. These places would have been pulled down long ago. Allah will thus most certainly help any group which rises to defend

the divine system based on justice and equity (wherein the freedom to worship is the basic right). Indeed Allah is most powerful and reigns supreme over everything. Think about it my friends! At what point divine permission is being given to fight. Prophet (PBUH) and his companions had been driven away from their homes in Mecca. They were helpless refugees in Medina. And then the Meccans brought their huge army to attack them in Medina.

If fight against evil forces become inevitable, then fight them with full force

My dear friends, it was at this point that permission was given for the first time to fight back – in self-defense. And when the fight was imposed on Muslims then they were told to give their all for this fight; they were asked to fight with all their might. If not, then conceding to their demands would have meant leaving Islam; it would have meant abandoning the دین (*Deen*); it would have meant accepting FALSEHOOD (*Baatil* - باطل); and most of all, it would have meant worse than death. This is what the next verse explains: فَإِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتَّىٰ إِذَا أَثْخَنتُمُوهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً حَتَّىٰ تَضَعَ الْحَرْبُ أَوْزَارَهَا ۚ ذَٰلِكَ وَلَوْ يَشَاءُ اللَّهُ لَانتَصَرَ مِنْهُمْ وَلَٰكِن لِّيَبْلُوَ بَعْضَكُم بِبَعْضٍ ۗ وَالَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَلَن يُضِلَّ أَعْمَالَهُمْ (47:4) – The enemy's opposition has transgressed to the extent that a clash seems imminent. Therefore when you face them in the battlefield, you too should kill them. And when their strength is broken and you have fully subdued them, the remaining should be taken into your custody as prisoners of war (8:67). Then (as the circumstances demand) set them free either as an act of grace or after taking ransom (monetary reward or by exchange of your own prisoners), till all possibilities of waging war are eliminated (and peace and order returns). It is for this purpose that you are permitted to raise arms. Also remember that if Allah had so willed, He could have punished these opponents in other ways. However He desires that an open clash like this would clearly show how much capability you have acquired to fight against the enemy and to survive. As for those who have laid down their lives for the establishment of the Divine Order, rest assured that their deeds will not go to waste. Life is a continuous journey and does not end with physical death.

At the time, in the entire world – and especially among the Arabs – it was custom to make prisoners of wars slaves and their women concubines. Muslims could have done that and the Quraysh would have accepted it as

being normal action pertaining to war. But that would have been against the دین (*Deen*); that would have been against Allah's command regarding humankind: وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ (17:70) – Indeed We have conferred dignity on every human being. So, what to do with the Quraysh who became prisoners of war in the hands of Muslims?

Eternal principle of the Quran regarding prisoners of war

My dear friends, now comes an extremely important point. Making slaves and concubines through warfare was commonly accepted norm those days. They were considered as commodities to be bought and sold; they were given as gifts to be used the way one preferred. Concubines were distributed among victorious soldiers for their pleasure and service. These were considered perfectly permissible acts those days. It was in this prevailing environment, my dear friends that the Quran said: فَإِمَّا مَنًا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً (47:4) – Then set them free either as an act of grace or after taking ransom (monetary reward) or by exchange of your own prisoners. Allahu Akbar! Do you see my friends what Islam did to the world? What an incredible revolution the Prophet (PBUH) created in the world? What an extraordinary pronouncement was delivered to the world in a couple of words that forever stopped slavery, the worst kind of inhuman practice meted out to human beings? However, it is shameful what the religious priesthood had done in the name of Islam. It is so ironic and heart-wrenching that it has sanctioned slavery in the name of Islam.

Religion sanctions slavery – in the name of Islam

Turning against Allah's دین (*Deen*), turning against the above clear injunction of Allah, turning against the Prophet's action of forever forbidding slavery – our custodians of religion say that making slaves and concubines are allowed in Islam. To do this they self-crafted religion and promulgated man-made Sharia to replace the دین (*Deen*) of Allah at the behest of Mulukiyah. The kings – who (mis)named themselves as Khalifa – turned against the practices of rightly-guided Khalifas and laid the foundation of hereditary kingship against the clear injunctions of the Quran. They used to have three thousand concubines in their palaces. They practiced even the worse system of slavery and concubinage than that existed before Islam. They started making concubine and slave at will whomever they wanted. There were regular processions of concubines in Baghdad during their reign. There were markets in Baghdad where concubines were bought and sold and auctioned off.

To be Continued

محسوس سجدہ اس کے اس پرخلوص جذبہ کا بیساختہ مظہر نہیں اور محض (Form) ہی (Form) ہے' تو اس سجدے کے کوئی معنی نہیں۔ درحقیقت رکوع وسجود وعبادت کی روح انسان کے جذبہ فرماں پذیری اور اطاعت کے محسوس مظہر ہیں۔ اگر انسان خدا کی اطاعت تو نہ کرے اور صرف اس محسوس شکل کو مقصود بالذات سمجھ لے' تو نہ صرف خدا کی میزان میں اس کا کوئی وزن نہیں بلکہ قرآن کریم کے الفاظ میں انسان کے لئے تباہی کا موجب ہے۔ قرآن کریم میں ان محسوس ارکان (Form) کی تھوڑی سی شکل صلوٰۃ اور حج کی تقاریب میں باقی رکھی گئی ہیں اور وہ بھی انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی عمل ہیں۔ جن میں ضروری ہوتا ہے کہ ان کی محسوس شکل میں یک جہتی اور ہم شکلی ہو۔ یہ اجتماعی شکل نزول قرآن کے وقت میں' نبی اکرم ﷺ اور جماعت مومنین میں رائج تھی اور مساجد میں ادا کی جاتی تھی۔ جس طرح سجدہ سے مراد صرف سر کو زمین پر رکھنا نہیں بلکہ اس سے مفہوم قوانین خداوندی کے سامنے سر جھکا دینا بھی ہے' اسی طرح مسجد سے بھی بالخصوص وہ عمارت نہیں جس میں نماز ادا کی جاتی ہے۔ اس سے مراد وہ مقام ہے جو نبی اکرم ﷺ کے زمانہ میں لیا جاتا تھا جو اس نظام کا مرکز ہو جس کی رو سے قوانین خداوندی کی اطاعت کی یا کرائی جائے۔ اس میں اسلامی مملکت کے مختلف امور سرانجام دیئے جا سکتے ہیں۔ قرآن کریم کی رو سے ''عبادت'' کے معنی اطاعت کے ہیں اور دنیا کا کوئی کام جو قوانین خداوندی کے مطابق کیا جائے عبادت ہو جاتا ہے۔ اجتماع صلوٰۃ بھی چونکہ قانون خداوندی کی اطاعت ہے اس لئے وہ بھی عبادت ہے۔ ''عبادت'' کے لئے کسی ایسے الگ مکان کی ضرورت نہیں جس میں اور کچھ نہ کیا جا سکے۔

عبادت کا مفہوم سمجھنے کے لئے یہ ملحوظِ نگاہ رکھنا ضروری ہے کہ:

(1) قرآن میں جہاں اللہ کی عبادت کا ذکر ہوگا' اس کے معنی قوانین خداوندی کی برضا ورغبت اطاعت ہوں گے (1:5)۔

(2) قرآن میں جہاں طاغوت اور شیطان کی عبادت کا ذکر ہوگا' اس سے مفہوم یا تو انسانوں کے خود اپنے جذبات یا **من دون اللہ**' باطل پرست مذہبی پیشواؤں کی اطاعت ہوگی' اِن سے منع کیا گیا ہے (30:13, 19:44)۔

(3) قرآن میں جہاں بتوں یا دیوی دیوتاؤں کی عبادت کا ذکر ہوگا' وہاں مفہوم اِن کی توہم پرستانہ پرستش ہوگا (19:42)۔

(4) قرآن میں **عبادُ الرَّحمٰن** کے معنی ہیں وہ لوگ جو زندگی کی ہر سانس میں قوانین خداوندی کی اطاعت کریں (51:56)۔

☆☆☆

(اشاعت کے لئے محترم ڈاکٹر انعام الحق نے تعاون کیا ہے۔)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

PUBLISHED SINCE 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL.NO. 28
VOL. 72
ISSUE
5

Monthly

TOLU-E-ISLAM

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546, 042-35753666 E-mail:idarati@gmail.com
Web:www.toluislam.com www.facebook.com/talueislam/
www.youtube.com/idaratolueislam/

یومِ تکبیر 28 مئی 1998ء
جب پاکستان عالم اسلام کی پہلی ایٹمی طاقت بنا



یہ غازی یہ تیرے پُر اسرار بندے
جنہیں تُو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی
دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی



